ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل ———— جون ۱۹۹۴ء

—: ایڈیٹر :—

سید جلال الدین عمری

پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۳ شمارہ ۲

اپریل ——— جون ۱۹۹۴ء

شوال ——— ذوالحجہ ۱۴۱۴ھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان سے ——— ۵۵ روپے

پاکستان سے ——— ۱۰۰ روپے

دیگر ممالک سے ——— ۲۰ ڈالر

فی شمارہ ——— ۱۵ روپے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لیے ناز پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

غیر مسلموں سے تعلقات اور اسلام	سید جلال الدین عمری	۵

تحقیق وتنقید

تصوف اور شیعیت	ڈاکٹر محمد ذکی	۱۸

بحث ونظر

عہد عثمان میں جمع قرآن	ڈاکٹر حافظ محمود اختر	۵۲
ترجمان القرآن مولانا فراہی کا مسلک حدیث	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۷۷

سیر وسوانح

کیا البیرونی سندھی تھے؟	پروفیسر محمد صابر خاں	۹۷

تعارف وتبصرہ

بعض عربی کتابوں کے جدید اڈیشن	جناب عبدالمتین منیری	۱۰۱
خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی		۱۱۵

اس شمارہ کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر محمد ذکی

استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۔ ڈاکٹر حافظ محمود اختر

ایسوسی ایٹ پروفیسر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز پنجاب یونیورسٹی لاہور

۳۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۴۔ پروفیسر محمد صابر خاں

پروجیکٹ ڈائریکٹر انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی ۔ نئی دھلی

۵۔ جناب عبدالمتین منیری

وزارۃ الشؤون الاسلامیہ والاوقاف ص ب ۳۹۰۷ دبئی

۶۔ سید جلال الدین عمری

سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

خوش نویس

احرازالحسن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

غیرمسلموں سے تعلقات اور اسلام

(۲)

سید جلال الدین عمری

عام غیرمسلموں کے ساتھ حسن سلوک

غیرمسلم والدین، رشتہ داروں اور ہمسایوں سے جس طرح کے خوش گوار تعلقات کی اسلام نے اجازت دی ہے اس کا ذکر اس سے پہلے ان ہی صفحات میں آچکا ہے[1]۔ اب اس سلسلہ کی بعض عمومی تعلیمات پیش کی جارہی ہیں۔ یہ تعلیمات صاف بتاتی ہیں کہ عام غیرمسلموں سے ربط وتعلق سے اسلام نے منع نہیں کیا ہے۔ وقت ضرورت ان کی خدمت کرنا اور ان کے دکھ درد میں کام آنا اس کے نزدیک ایک پسندیدہ عمل اور کار ثواب ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کچھ ذہنی تحفظات تھے تو اسلام نے انھیں رفع کیا ہے اور کسی قسم کے شک وشبہ کو باقی رہنے نہیں دیا ہے۔

سورۂ بقرہ میں ایک جگہ راہِ خدا میں انفاق کا ذکر ہے، اس کی ترغیب ہے، اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ خرچ کرنے اور نام ونمود اور ریاکاری سے بچنے کی تاکید ہے، کھلے چھپے ہر طریقہ سے انفاق کا حکم ہے، خاص طور پر ان لوگوں کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت ہے جو دست سوال دراز نہیں کرتے۔ (آیت ۲۶۱ تا ۲۷۴) عین ان تفصیلات کے بیچ میں ایک آیت آئی ہے جو قابل غور ہے اور ہمارے موضوع سے اس کا خاص تعلق ہے۔ ارشاد ہے:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ	(اے پیغمبرؐ!) آپ پر ان کو ہدایت
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ	بخش دینے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ البتہ
يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ	اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا

---

[1] سہ ماہی تحقیقات اسلامی جلد ۱۳، شمارہ ۱، جنوری۔ مارچ ۹۴ء

فَلِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ۝ (البقرہ: ۲۷۲)	ہے۔ تم جو بھی مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ تم ہی کو پہنچے گا۔ (دیکھو) تم اللہ کی رضا ہی کے لیے تو خرچ کرتے ہو۔ تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اس کا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہ ہوگی۔

یہ آیت یہاں کیوں آئی ہے، اس کا اصل مضمون سے کیا تعلق ہے، اس بارے میں تفسیر میں متعدد روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت تھی کہ مسلمان جو کچھ صدقہ وخیرات کریں وہ مسلمانوں ہی پر کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]

ایک روایت میں اس ممانعت کی وجہ بھی بیان ہوئی ہے سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ ذمیوں میں جو حاجت مند ہوتے مسلمان ان پر انفاق کیا کرتے تھے۔ جب مسلمانوں ہی میں حاجتمندوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا:۔

لا تتصدقوا الا علی اهل دینکم۔	اپنے ہم مذہب لوگوں ہی پر تم صدقہ و خیرات کرو۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان لوگوں پر بھی خرچ کرنے کی اجازت دی گئی جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں[2]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے۔ فرماتے ہیں انصار کے رشتے بنو قریظہ اور بنو نضیر سے تھے۔ انصار ان پر اپنا مال خرچ کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اسلام لے آئیں تو ان پر خرچ کیا جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[3] یہ روایت بتاتی ہے کہ پس منظر میں یہود اور ان سے تعلقات تھے۔ گویا آیت

---

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱/۳۲۳، ۳۲۴

[2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۳/۳۳۷

[3] ابن جریر، جامع البیان عن تاویل ای القرآن ۵/۵۸۸ طبع جدید دار المعارف مصر۔

نے ہدایت کی کہ ان کے نادار بھی حسن سلوک کے مستحق ہیں اور ان پر بھی انفاق ہونا چاہیے۔ بعض دوسری روایات میں اسی پس منظر کے ساتھ مشرکین کا ذکر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین پر انفاق نہیں کرتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

یہی بات صحابہ کرامؓ کے بارے میں بھی کہی گئی ہے کہ وہ اپنے مشرک قرابت داروں پر خرچ نہیں کرتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کی اجازت انھیں دے دی گئی۔[2]

حضرت قتادہؒ ایک عمومی بات بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ جو لوگ ہمارے ہم مذہب نہیں ہیں کیا ان پر بھی انفاق کیا جاسکتا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[3]

اسلام کی جس طرح ہر طرف سے مخالفت ہو رہی تھی اور اس کے ماننے والے جس طرح جور و ستم کا نشانہ بنائے جا رہے تھے، اس کے خلاف مسلمانوں کے اندر ردعمل کا پایا جانا غیر فطری نہ تھا۔ ان کے دل میں کبھی یہ سوال ابھرتا ہوگا کہ ان کے خویش واقارب اور دور و نزدیک کے لوگ آخر اس دین کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں جس میں سب کی صلاح و فلاح کا سامان ہے؟ کبھی یہ سوچتے ہوں گے کہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں ہمدردی کی جائے اور مشکلات میں ان کی مدد کی جائے جو زندگی بھر ہمارے راستے میں کانٹے بچھاتے اور ناوک فگنی کرتے رہے؟ کبھی یہ خیال آتا ہوگا کہ ان دشمنانِ دین کے ساتھ تعاون کا کوئی اجر و ثواب بھی ہے یا نہیں؟ کبھی یہ خواہش موجزن ہوتی ہوگی کہ کاش یہ ایمان لے آتے اور ہم اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کر دیتے؟ اوپر کی روایات ان سب کیفیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

قرآن مجید نے انفاق اور اس کے تقاضوں کو بیان کرتے ہوئے اس جذبہ کی

---

[1] ابن جریر: ۵/ ۵۸۷

[2] بیہقی۔ السنن الکبریٰ: ۴/ ۱۹۱ نیز ابن جریر حوالہ سابق۔

[3] ابن جریر: ۵/ ۵۸۸۔

بھی اصلاح کی ہے کہ تعاون اور ہمدردی کے مستحق صرف اپنے ہم مذہب افراد ہیں اور ان ہی کے ساتھ حسن سلوک ہونا چاہیے۔ اس نے کہا کہ انسانوں کی خدمت کی راہ میں عقیدہ وخیال اور دین ومذہب کے اختلاف کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ جو شخص ضرورت مند ہے اس کی مدد کرنا دینی اور اخلاقی فرض ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، مشرک ہو یا اہل کتاب، رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار۔ آدمی کی یہ خواہش یا اصرار کہ لوگ ایمان لے آئیں تو ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ایمان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے اندر طلب صادق پائی جاتی ہے اسے وہ اس دولت سے نوازتا ہے۔ آدمی یہ سوچ کر انسانوں کی خدمت اور فلاح وبہبود کے کام کرتا چلا جائے کہ اس کا اجر وثواب اللہ نے چاہا تو محفوظ ہے اور کل وہ اس کے کام آئے گا۔ اس پورے پس منظر کے ساتھ آیت ان بہت سے الزامات کی تردید کرتی ہے جو اسلام کے کردار پر کیے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے بعض وہ روایات گزر چکی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم وغیر مسلم ہر فرد اور ہر طبقہ پر صدقہ وخیرات کی ہدایت فرمادی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں۔

فامر بالصدقة بعدها على كل من سألك من كل دين [1]	اس آیت کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ کسی بھی دین کا ماننے والا تم سے سوال کرے تو اس پر خرچ کرو۔

اسی سلسلہ کی ایک اور روایت ہے۔

تصدقوا على اهل الاديان [2]	تمام اہل مذاہب پر صدقہ وخیرات کرو۔

حضرت سعید بن مسیبؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی گھرانے پر صدقہ کیا تھا جو بعد میں بھی جاری رہا۔[3]

---

[1] ابن کثیر، تفسیر: ۱/۳۲۴

[2] رواہ ابن ابی شیبۃ عن سعید بن جبیر مرسلاً (نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ: ۲/۳۹۸)

[3] حوالہ سابق۔

اس آیت کے سیاق و سباق سے بحث کرتے ہوئے علامہ قرطبی کہتے ہیں۔

هٰذا الكلام متصل بذكر	یہ آیت صدقات کے ذکر سے ملی
الصدقات فكانه بيّن فيه	ہوئی ہے۔ گویا اس میں یہ واضح کیا
جواز الصدقة على المشركين[۱]	گیا ہے کہ مشرکین پر صدقہ کرنا جائز ہے۔

اس بحث کا تعلق مسئلہ کے اخلاقی پہلو سے ہے۔ آئیے اب ذرا اس کے فقہی اور قانونی رخ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے مال کا کتنا اور کون سا حصہ غیر مسلموں کی مدد اور ان کی فلاح وبہبود کے کاموں میں خرچ کرسکتا ہے اور کون سا حصہ خرچ نہیں کرسکتا؟

اسلامی شریعت میں صدقات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو فرض اور واجب ہیں اور دوسرے وہ جن کی نوعیت فرض یا واجب کی تو نہیں ہے لیکن اللہ کی رضا کے لیے کیے جاتے ہیں۔ فرض صدقات میں سب سے پہلے زکوٰۃ کا سوال سامنے آتا ہے۔ زکوٰۃ مال کی ایک خاص مقدار یا نصاب پر فرض ہوتی ہے۔ یہ صاحب نصاب مسلمانوں سے لی جاتی ہے اور متعین مدات میں غریب مسلمانوں کی فلاح وبہبود پر خرچ کی جاتی ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں۔

"اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ اموال زکوٰۃ غیر مسلم پر صرف نہیں ہوں گے"[۲]

زکوٰۃ کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں ان میں اس کے عمال اور کارندے بھی ہیں۔ اسے قرآن مجید نے 'والعاملین علیہا' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا زکوٰۃ کی وصولیابی اور تقسیم وغیرہ کے کام پر کسی غیر مسلم کو لگانا اور اس کا اسے محنتانہ دینا صحیح ہے یا نہیں؟ امام احمد بن حنبل سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ جس طرح اور کاموں پر اسے اجرت دی جاسکتی ہے اسی طرح اس کام پر بھی اسے اجرت دینا غلط نہیں ہے۔ مشہور حنبلی فقیہ علامہ خرقی کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔[۳]

۱ے قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۲/ ۳۳۷

۲ے ابن قدامہ، المغنی: ۲/ ۶۵۳ ۳ے حوالہ سابق ص ۶۵۲

صدقۂ فطر رمضان کے ختم ہونے پر ہر صاحب حیثیت یا فقہ حنفی کی رو سے ہر صاحب نصاب مسلمان پر واجب ہوتا ہے۔ یہ صدقہ اسے اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرنا ضروری ہے۔

صدقہ فطر کے بارے میں امام مالک، امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کے حکم میں ہے، لہٰذا اسے زکوٰۃ ہی کی طرح مسلمانوں پر صرف ہونا چاہیے لیکن امام ابوحنیفہ ذمیوں پر بھی اس کے صرف کو جائز سمجھتے ہیں۔ عمرو بن میمون وغیرہ کے بارے میں آتا ہے کہ فطرہ کی رقم سے وہ راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔[1]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے:

ولا یجوز ان یدفع الزکوٰۃ	کسی ذمی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔
الی ذمی ویدفع الیہ ماسوی	اس کے علاوہ دوسرے صدقات
ذالک من الصدقۃ[2]	اسے دئے جا سکتے ہیں۔

فطرہ کے بارے میں کہا گیا ہے۔

ویؤدی المسلم الفطرۃ	مسلمان اپنے اس غلام کی طرف
عن عبدہ الکافر[3]	سے بھی فطرہ ادا کرے گا جو کافر ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص نے فقہ حنفی کی ترجمانی کرتے ہوئے قرآن مجید کی بعض آیات کا حوالہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات مشرکین پر بھی کیے جا سکتے ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی تمام قسمیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے تمہارے اصحاب ثروت سے زکوٰۃ وصول کرنے اور تمہارے اصحاب حاجت پر اسے لوٹا دینے کا حکم ہے، اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جن صدقات کے وصول کرنے کا حق امام یا ریاست کو ہے وہ ذمیوں پر صرف نہیں ہو سکتے۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام صدقات

---

[1] ابن قدامہ۔ المغنی: ۳/۷۸ — [2] ہدایہ ج ۱ ص ۱۸۵

[3] ہدایہ ج ۱ ص ۱۸۹۔ اس پر جن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے ان کی صحت و ضعف پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ نصب الرایہ: ۲/۴۱۲ – ۴۱۶

ذمیوں کو دیئے جاسکتے ہیں۔ جیسے نذر کا صدقہ، غلطیوں کے کفارہ کا صدقہ یا صدقہ فطر۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ صدقات واجبہ غیر مسلموں پر صرف نہیں کیے جاسکتے۔ اسے انھوں نے زکوٰۃ پر قیاس کیا ہے۔[۱]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے فقہاء کے ہاں اس مسئلہ میں کتنی وسعت ہے اور انھوں نے کتنی گنجائش رکھی ہے۔

زکوٰۃ ایک چھوٹی سی مد ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کی جاتی ہے۔ دیگر صدقات واجبہ کی تعداد بھی بہت تھوڑی ہے۔ ان سے ہٹ کر انسانوں کی خدمت، تعاون اور ہمدردی کی بہت سی شکلیں ہیں۔ اسلام ان سب کی ترغیب دیتا اور تشویق پیدا کرتا ہے۔ ان کے ذریعہ مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہونچایا جاسکتا ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک

انسان جب خدا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھتا ہے تو اس کے ہاتھوں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے حقوق محفوظ نہیں رہ پاتے۔ وہ کمزوروں، ناداروں، یتیموں اور مسکینوں پر ستم ڈھانے اور ان کے حقوق پر دست درازی کرنے لگتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کہی گئی ہے۔[۲] اس کے برخلاف خدا کے نیک بندوں کا کردار وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ	اور وہ کھانا کھلاتے ہیں، اس کی
مِسْكِينًا وَّيَتِيمًا وَّ	خواہش اور طلب کے باوجود مسکین،
أَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ	یتیم اور قیدی کو اور کہتے ہیں کہ ہم تو تمہیں
اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً	صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں

---

[۱] جصاص، احکام القرآن: ۱/۴۴۷ - ۵۴۸

[۲] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔ سورۃ الفجر ۱۷ - ۱۹۔ سورۃ البلد - ۱۱ - ۱۷۔ سورہ المدثر: ۴۴۔ اس کی پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ۔ کمزور — اسلام کے سایہ میں۔ مطبوعہ ماہنامہ زندگی۔

وَّلَا شُكُوْرًا ٥ اِنَّا نَخَافُ مِنْ	تم سے کسی بدلہ یا شکریہ کے طالب نہیں ہیں
رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ٥	ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے
	عذاب کا ڈر ہے جو سخت مصیبت والا اور
	طویل ہوگا۔ (الدہر: ۸-۱۰)

معاشرہ کے کم زور افراد کو کھانا کھلانا، خدا کے نیک بندوں کے مجموعی کردار کی محض ایک علامت ہے۔ یہاں اسی پہلو سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ انھیں بے سہارا نہیں چھوڑتے، مشکلات میں ان کے کام آتے ہیں۔ ان کو کھلاتے پلاتے اور ان کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھتے ہیں۔

یہاں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ قیدیوں کا بھی ذکر ہے۔ اس کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ یتیم اور مسکین چاہے اپنے ہوں یا پرائے، ان کا تعلق کسی بھی قوم اور طبقہ سے ہو، ان کی بے کسی اور مظلومی کا احساس پایا جاتا ہے یہی احساس آدمی کے اندر ان سے ہمدردی کے جذبات ابھارتا ہے۔ وہ ان کی مدد کرے یا نہ کرے انھیں مدد کا بہرحال مستحق سمجھتا ہے۔ صرف شقی القلب اور خود غرض انسان ہی ان جذبات کو دبا سکتا ہے۔ لیکن قیدیوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ سماجی مجرم سمجھے جاتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کا وہ جذبہ عام حالات میں مفقود ہوتا ہے جو کسی یتیم یا مسکین کے سلسلے میں پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قیدیوں کے ساتھ دنیا میں بہت ہی برا سلوک ہوتا رہا ہے، انھیں سخت سے سخت اذیتیں دی جاتی تھیں، وہ کال کوٹھریوں میں پڑے پڑے ختم ہو جاتے تھے۔ باہر نکلتے تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ہوتی تھیں، ان کی ضروریات کی تکمیل کی کوئی متعین صورت نہ تھی۔ بسا اوقات بھیک پر ان کا گزارہ ہوتا تھا۔ ان حالات میں اسلام نے اپنے ماننے والوں کے اندر قیدیوں کے مجرم اور گناہ گار ہونے سے زیادہ ان کے انسان اور ہمدردی کے مستحق ہونے کا جذبہ ابھارا۔

یہ آیت سورۂ دہر کی ہے۔ عام طور پر علماء نے اسے مدنی قرار دیا ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مقاتل، کلبی اور یحییٰ بن سلام نے اسے مکّی کہا ہے۔ اس کی تائید

سورہ کے مضامین سے بھی ہوتی ہے۔ مکہ کے اصحاب ثروت اور زر پرست مسکینوں اور یتیموں کے ساتھ جس شقاوت اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے قیدیوں کے ساتھ ان کا سلوک اس سے مختلف نہیں رہا ہوگا۔ اسلام نے اس پورے رویہ پر تنقید کی اور اللہ کے نیک بندوں کی تعریف کی کہ وہ ظلم وجور کے شکنجہ میں کسے ہوئے قیدیوں کو اپنی محبت اور حسنِ سلوک سے راحت پہونچا رہے ہیں۔

مشہور تابعی مفسر عکرمہ نے 'اسیر' سے غلام مراد لیا ہے۔ علامہ ابن جریر طبری نے اس رائے کو پسند فرمایا ہے۔ ان کے نزدیک 'اسیر' کا لفظ عام ہے اس میں مسلم اور مشرک دونوں طرح کے غلام آجاتے ہیں[1]

غلامی بھی ایک طرح کی قید ہی ہے۔ قرآن مجید نے بندِ غلامی کو توڑنے اور غلاموں کو آزاد کرنے کی تحریک شروع کی اور ترغیب وتشویق کے ذریعہ اسے آگے بڑھایا۔

مدینہ میں جب اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو خدا کے ان نیک بندوں نے قیدیوں کے ساتھ جس حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا اس کی مثال پوری انسانی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

اس بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ 'اسیر' سے اس آیت میں کس قسم کے قیدی مراد ہیں۔

ہر ریاست بعض خاص قسم کے جرائم کے ارتکاب پر اپنے شہریوں کو قید وبند کی سزا دیتی ہے۔ یہ شہری یا ملکی قیدی ہیں۔ ریاست حالتِ جنگ میں ہو تو دشمن کے افراد بھی قیدی بنائے جاتے ہیں۔ انھیں غیر ملکی قیدی کہا جا سکتا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں دونوں طرح کی رائیں ملتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

الاسیر من اھل الشرک	اسیر وہ ہے جس کا تعلق مشرکین سے
یکون فی ایدیھم	ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ میں (قیدی) ہے

یہی تفسیر قتادہ اور سعید بن جبیرؒ نے کی ہے۔ حضرت قتادہؒ کہتے ہیں۔

لقد امر اللہ بالاسریٰ ان	اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے ساتھ

---

[1] ابن کثیر، تفسیر: ۴/۴۵۵

یحسن الیھم وان اسراھم — حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور اس دور
یومئذ لاھل الشرك[1] — میں ان کے قیدی اہل شرک ہی ہوتے تھے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ 'اسیر' اہل قبلہ (مسلمان) اور غیر اہل قبلہ (غیر مسلم) دونوں ہی ہوسکتے ہیں۔

امام قرطبی نے اسے ایک جامع قول قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں مشرک قیدی کو کھانا کھلانا بھی اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہے۔ البتہ اس پر خرچ فرض صدقات سے نہیں، نفل صدقات سے ہوگا[2]

علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ یہاں 'اسیر' سے مراد مشرک قیدی ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان قیدی کو علی الاطلاق 'اسیر' نہیں کہا جاتا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ قیدی کو کھانا کھلانا، اللہ سے تقرب کا ذریعہ ہے۔ آیت کے الفاظ سے بظاہر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرک قیدیوں پر ہر طرح کے اموال صدقات صرف کیے جاسکتے ہیں لیکن (جیسا کہ پہلے گزر چکا) ہمارے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ اس سے وہ صدقات مستثنیٰ ہیں جن کے وصول کرنے کا حق حاکم کو ہے[3]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ان تعلیمات کا عملی ثبوت ہے۔

جنگ بدر میں مشرکین کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر ہی قیدی بنائے گئے[4] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کو صحابہ کرامؓ کے درمیان تقسیم کردیا اور نصیحت فرمائی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے[5] اس پر عمل جس طرح ہوا اس کا ذاتی تجربہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۹/۱۲۹ [2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۹/۱۲۹

[3] احکام القرآن: ۳/۵۷۹ [4] بخاری، کتاب المغازی۔ ابن ہشام میں ہے کہ قیدی ستاون[57] تھے۔ ان میں بیشتر کا نام بنام ذکر ہے۔ ابن ہشام ۲/۳۶۴ - ۳۶۷، قیدیوں کی تعداد میں اور بھی اختلافات ہیں، بخاری کی روایت صحیح اور معتبر ہے۔ ملاحظہ ہو ابن کثیر، السیرۃ النبویہ ۲/۴۵۶، ۴۶۳۔

[5] ماوردی نے ایک کمزور سی روایت نقل کی ہے کہ مہاجرین میں سے سات افراد نے بدری قیدیوں کی کفالت کا بوجھ اٹھایا تھا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ حضرات ابوبکر، عمر، علی، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعید بن العاص اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم۔ ماوردی، النکت والعیون: ۴/۳۷۰۔ انصار کے سلسلہ کی تفصیل نظر سے نہیں گزری۔

بھائی ابوعزیز بن عمیر کی زبانی سنئے:۔

وہ اس جنگ میں نضر بن حارث کے بعد مشرکین کے علم بردار تھے۔ فرماتے ہیں کہ وہ بعض انصار کے حوالے کئے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کا ان پر یہ اثر تھا کہ صبح و شام کھانے کے وقت مجھے روٹی کھلاتے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے۔ ان میں سے کسی کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ملتا تو مجھے دے دیتا۔ اسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ اس سے مجھے شرم سی محسوس ہوتی تھی[1]

یہ جنگ بدر کے قیدیوں کا ذکر ہے اور قیدیوں کے ساتھ بھی یہی مہذب اور شریفانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں:

كان رسول الله صلى الله	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
عليه وسلم يوتى بالاسير	قیدی لایا جاتا تو آپ اسے کسی مسلمان کے
فيدفعه الى بعض	حوالہ کر دیتے اور فرماتے کہ اس کے ساتھ اچھا
المسلمين فيقول احسن اليه	سلوک کرے۔ یہ قیدی اس کے پاس دو
فيكون عنده اليومين والثلاثة	تین دن رہتا اور وہ مسلمان اس کی ضروریات
فيوثره على نفسه[2]	کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا تھا۔

جنگ بدر کے قیدیوں ہی کے سلسلہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو میں سہیل بن عمرو کے اگلے دانت توڑ دوں تاکہ اس کی زبان باہر نکل آئے اور وہ پھر کہیں آپ کے خلاف اپنی خطابت کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں (اس طرح کی) سزا دوں تو اللہ مجھے بھی سزا دے سکتا ہے گو کہ میں نبی ہوں۔ ایک اور روایت میں ہے، ممکن ہے کہ کل وہ کسی ایسی حیثیت میں ہو جو تمہارے لیے ناگوار نہ ہو[3]

اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں ملکی قیدیوں اور قید خانوں کے متعلق قوانین موجود ہیں اور اصلاحات ہوئی ہیں، جنگی قیدیوں کے بارے میں بھی بعض بنیادی اصول تسلیم

---

[1] ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲/ ۲۸۸ [2] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴/ ۱۹۶

[3] ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲/ ۲۹۳

کیے جاتے ہیں لیکن ایک تو ان کا چرچا زیادہ ہے پابندی کم ہے؛ دوسرے یہ کہ ان اصلاحات اور قوانین کا تعلق ریاست سے ہے، عوام ان سے غیر متعلق رہتے ہیں، انھیں ان سے دل چسپی نہیں پیدا ہوتی۔ اسلام نے ریاست کے ساتھ اس کے ایک ایک فرد میں قیدیوں سے ہمدردی کے جذبات پیدا کیے۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ نے یہ کارنامہ دیکھا کہ جو قوم اسلام کے ماننے والوں سے برسرِ پیکار تھی اور جو انھیں ختم کرنے اور مٹانے کے درپے تھی، اس کے افراد جب میدان جنگ سے گرفتار ہو کر آئے تو انھوں نے خود تکلیف اٹھا کر ان قیدیوں کو راحت پہونچائی، خود بھوکے رہے یا روکھا سوکھا کھایا اور انھیں اچھا کھلایا پلایا، ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھا۔ ان کی یہ ساری خدمت بے لوث اور بے غرض تھی، وہ نام و نمود نہیں چاہتے تھے، انھیں کسی صلہ کی تمنا نہ تھی۔ ان کے سامنے صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی تھی۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اسی کے لیے کرتے تھے۔

اس طرح اسلام نے بتایا کہ غیر ملکی اور دشمنوں کی صف سے گرفتار ہونے والے قیدی بھی بہتر سلوک کے مستحق ہیں، ان کے ساتھ غیر انسانی رویہ اختیار کرنا اور انھیں ذہنی اذیت پہونچانا ناروا ہے۔ وہ گو دشمن ہیں لیکن انسان ہیں۔ جب وہ اپنے حقوق حاصل کرنے میں آزاد نہیں ہیں تو ان کے انسانی حقوق کا احترام ہمارا فرض ہے۔ ریاست کو یہ حق بھی ہے کہ اگر اس کے مفادات کو نقصان پہونچنے کا خطرہ نہ ہو تو فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ کے انھیں آزاد کر دے۔ یہ سب باتیں اسلام کے قوانین جنگ کا ایک حصہ ہیں۔ ان سے دنیا نے جنگ و صلح کے بین الاقوامی اصول و آداب سیکھے اور بہت سی اصلاحات کیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں تو دشمن کے قیدیوں کے ساتھ اس حسن سلوک کا ذکر ہوا ہے جس کی اسلام نے تعلیم دی اور جس کا عملی نمونہ اس کے ماننے والوں نے پیش کیا۔

بعض لوگوں نے سورۂ دہر کی زیر بحث آیت کا تعلق مسلمان قیدیوں سے بھی جوڑا ہے۔ ظاہر ہے دشمن اور غیر ملکی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے، مسلمان قیدیوں کے سلسلہ میں اس سے بہتر رویہ ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ حضرت قتادہؓ کہتے ہیں:۔

كان اسيرهم يومئذ	اس وقت ان کے قیدی مشرک
المشرك واخوك المسلم	تھے (ان کے ساتھ یہ حسن سلوک رہا)
احق ان تطعمه [1]	تمہارا بھائی جو مسلم ہے وہ تو اس
	بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اسے
	کھلاؤ پلاؤ (اور اس کی ضروریات کا خیال رکھو)

اسلام کی روح یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے شہری قیدیوں کے ساتھ بھی بہتر سے بہتر سلوک ہو۔ اس کے لیے وہ جو بھی قواعد وضوابط بنائے ان میں یہی روح کارفرما ہونی چاہیے۔ (ختم شد)

---

[1] زمخشری، الکشاف: ۴/۱۹۶

مسلمان عورت کے حقوق اور اُن پر اعتراضات کا جائزہ

از مولانا سید جلال الدین عمری

انجمن الاصلاح ندوۃ العلماء کے ناظم اس کتاب کے مطالعہ کے بعد لکھتے ہیں:-

"اس موضوع پر اور بھی کتابیں نظر سے گزری ہیں اردو میں بھی اور عربی میں بھی لیکن اس جیسی سہل اور عام فہم زبان میں اور اپنے موضوع پر دلیل و برہان سے مُزیّن، حوالہ جات سے پُر اور خاص وعام دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید اور کوئی کتاب نہیں ملی۔

ہمارے دینی مدارس کے طلبہ بھی اس موضوع پر کیے گئے سوالات کو جدید اور ناقابلِ حل سمجھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آنجناب کی یہ تصنیف کافی حد تک گرہ کشائی کر رہی ہے۔ مجھے اس کتاب سے بہت سی باتیں اور معلومات حاصل ہوئیں اور بہت سے سوالات کے جواب ملے۔" (سلیمان احمد بشیر)

اپنے موضوع پر یہ گراں قدر اور معلومات افزا کتاب درج ذیل پتے سے حاصل کی جا سکتی ہے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

تحقیق و تنقید

تصوف اور شیعیت

(۲)

ڈاکٹر محمد ذکی

صوفیہ کو "علم باطن" کی ضرورت اور اس سے دلچسپی؟

شیعہ فرقے نے جس دینی سرمائے کو رد کیا اسے دوسرے تمام مسلمان (یعنی اہل سنت والجماعت) صحیح اور قابل اعتبار مان کر پہلے ہی قبول کر چکے تھے۔ اور ان میں یہ عقیدہ راسخ ہو چکا تھا کہ دین اسلام مکمل ہو چکا، قیامت تک اب کوئی نبی آئے گا نہ کسی نئی آسمانی کتاب یا ہدایت کی ضرورت باقی ہے، اور مسلمانوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق دنیاوی زندگی گزارنے اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جن ہدایات کی ضرورت ہے وہ سب قرآن و سنت میں موجود ہیں۔ ان ہدایات ہی کی روشنی میں علماء اور فقہاء نے جو ایک جامع دستور العمل تیار کیا وہ بہ شکل شریعت و فقہ موجود تھا، اور مسلمانوں کو مزید کسی نئی شریعت کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

صوفیہ کرام کی بھاری اکثریت کا تعلق مسلمانوں کے اسی طبقے سے تھا لیکن ان کے بہت سے عقائد و نظریات عام مسلمانوں سے مختلف تھے اور ان کا وضع کردہ خانقاہی نظام بھی اس نظام سے بہت مختلف تھا جسے علماء اور فقہاء نے ترتیب دیا تھا۔ تاہم صوفیہ کا کہنا تھا کہ تصوف اسلام سے باہر کی کوئی چیز نہیں بلکہ دین ہی کا ایک حصہ ہے اور اس کے تمام اصول قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں۔

اپنے اس موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے صوفیہ کرام ایک طریقہ تو وہ اختیار کر سکتے تھے جو شیعہ علماء نے اختیار کیا تھا یعنی یہ دعویٰ کرتے کہ علماء اور فقہاء نے جو قانون شریعت کے نام سے مرتب کیا ہے وہ قابل اعتبار نہیں بلکہ حقیقتاً قرآن و حدیث کے خلاف ہے، اور جس نظام کی تشکیل اکابر صوفیہ نے کی ہے وہی دراصل قرآن و سنت پر

مبنی ہے۔ لیکن صوفیہ نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا، اور کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

ایک تو یہ کہ اتنے بڑے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے جتنے مضبوط دلائل کی ضرورت ہے وہ صوفیہ پیش نہیں کر سکتے تھے۔

دوسری یہ کہ اُن پر صریحاً شریعت یعنی قرآن و حدیث کی مخالفت کا الزام عائد ہو جاتا اور وہ اہل سنت کے دائرے سے خارج ہو جاتے اور سنی حلقے اُن سے بدظن ہو جاتے۔

چنانچہ انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ ان کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور شریعت کی مخالفت کا الزام بھی عائد نہ ہو۔

پہلا کام تو ان بزرگوں نے یہ کیا کہ قرآن و سنت کی پیروی پر بہت زور دیا۔ تقریباً تمام مشائخ نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں کتاب و سنت کی پابندی کی تاکید کی ہے یہاں ہم چند اکابر صوفیہ کے تاکیدی اقوال نقل کرتے ہیں۔

(۱) تصوف کی اصل یہ چیزیں ہیں: کتاب و سنت کی پابندی......

(۲) ہمارے طریقہ کے اصول سات ہیں: کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا، سنت کی پیروی.....

(۳) یہ علم (تصوف) کتاب و سنت سے مقید ہے، یعنی علم تصوف کتاب و سنت سے حاصل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق عمل ہوگا اور جو شخص علماً و عملاً اس سے خارج ہو وہ زندیق (بے دین) ہے۔

(۴) راستہ واضح ہے اور کتاب و سنت ہمارے درمیان موجود ہے اور صحابہؓ کا فضل و شرف معلوم ہے..... ہم میں سے جس نے کتاب و سنت میں جو کچھ ہے اس پر عمل کیا... اس نے ابدی سعادت کا راستہ پالیا۔

(۵) اللہ تک پہنچانے والے راستے کا رہنما بجز متابعت رسولؐ کوئی اور نہیں ہے، متابعت آپؐ کے احوال، افعال اور اقوال سب میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

(۶) کتاب و سنت کو اپنے سامنے رکھو، تامل و تدبر کے ساتھ ان دونوں کا مطالعہ کرو انھیں دونوں کو اپنا دستور العمل بناؤ اور قال و قیل اور ہوا و ہوس سے دھوکا نہ کھاؤ۔

(۷) سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہمارا کوئی نبی نہیں کہ ہم اس کی پیروی کریں اور قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں کہ ہم اس پر عمل کریں۔ لہٰذا تم ان دونوں کے دائرے سے باہر نہ نکلو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے ....سلامتی کتاب وسنت کے ساتھ ہے اور ہلاکت غیر کتاب وسنت کے ساتھ۔

(۸) جس شخص نے قرآن وحدیث کے احکام نہیں سمجھے اور ان کا علم حاصل نہیں کیا تصوف میں اس کی اقتدا نہیں کی جاسکتی۔

(۹) جو شخص اپنے آپ کو آداب شریعت کا پابند کر دیتا ہے، اللہ اس کے قلب کو نور معرفت سے روشن کر دیتا ہے اور حبیب خدا کی متابعت سے اشرف کوئی مقام نہیں ہے۔

(۱۰) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن سنت کا اتباع، عبادات، عادات واخلاق اور اعتقادات سب میں لازم ہے اور یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ان کی سنت اور طریقے کے خلاف ہے وہ باطل ہے[۱]۔

صوفیاء کرام نے اس پر جس طرح عمل کیا اس کی شہادت شیخ شہاب الدین سہروردی جیسے بزرگ نے یوں دی ہے:۔

"صوفیائے کرام مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو اتباعِ رسولؐ میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئی ہے کیوں کہ انھوں نے آپ کے اقوال کی مکمل پیروی کی ہے۔ آپ نے جس بات کا حکم دیا انھوں نے اس کی تعمیل کی اور جس بات سے روکا اس سے باز رہے[۲]۔"

اس قسم کے بیانات اور شہادتوں نے سُنّی حلقوں میں صوفیہ کرام کا اعتبار قائم کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کی دنیا سے بے نیازی، عبادت وریاضت میں انہماک، ان کے تقدس، زہد اور تقویٰ کی شہرت اور کرامات کی داستانوں نے لوگوں کے دلوں کو مسحور اور ان کی پوزیشن کو بہت مستحکم کر دیا۔

دوسرا بڑا کام صوفیۂ کرام نے یہ کیا کہ مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ بلاشبہ شریعت پر عمل کرنا ضروری ہے لیکن اس کے ذریعہ صرف ظاہری پاکیزگی حاصل ہو سکتی ہے، انسان کا صرف

---

[۱] مولانا عروج قادری نے "اسلامی تصوف" (۱۶—۲۳) میں یہ اقوال نقل کیے ہیں۔

[۲] عوارف ص۸

ظاہر درست ہو سکتا ہے باطن نہیں۔ مثلاً غسل اور وضو سے جسم تو پاک ہو جاتا ہے دل پاک و صاف نہیں ہوتا۔ اسی طرح مقررہ شرائط و ارکان کے ساتھ اگر نماز ادا کی جائے تو از روئے شریعت اللہ کے حکم کی تعمیل ہو گئی لیکن کیا حضور قلب اور خشوع و خضوع کے بغیر بھی نماز ادا ہو سکتی ہے اور کیا اس سے آخرت میں کوئی فائدہ حاصل ہو سکے گا؟ اسی بات کو امام غزالیؒ نے اس طرح سمجھایا ہے:۔

"اگر کوئی شخص نماز اس کی تمام شرائط کے ساتھ ادا کرے، مگر تکبیر اولیٰ کے علاوہ شروع سے آخر تک پوری نماز میں غافل رہے اور کاروباری معاملات میں غور و فکر کرتا رہے، تو فقیہ یہی کہے گا کہ اس کی نماز ادا ہو گئی حالانکہ آخرت میں اس نماز سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا..... فقیہ خشوع خضوع اور حضور دل کے درپے نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ یہ جانتا ہے کہ خشوع و خضوع اور استحضار قلب سے ظاہری عمل آخرت میں مفید ہوتا ہے[1]"

خشوع و خضوع کے حصول، باطنی اصلاح اور تصفیۂ قلب کے لیے کیا کیا جائے، امام صاحب کا مشورہ یہ ہے:

"سب سے اہم اور ضروری علم جسے سب لوگوں نے چھوڑ رکھا ہے وہ دل کی صفات کا علم ہے۔ یعنی یہ معلوم کرنا کہ ان میں سے کون سی صفت اچھی ہے اور کون سی بُری۔ ایسا کوئی انسان نہیں جو بُری صفات و عادات سے خالی ہو اور حرص و حسد، ریا و کبر اور عجب وغیرہ جیسی خصلتیں اس میں نہ ہوں۔ یہ سب عادات مہلک ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا اور ظاہری اعمال میں مشغول رہنا ایسا ہی ہے جیسے خارش یا پھوڑوں کے مرض میں صرف جسم کے ظاہری حصوں پر لیپ کرلے اور اندر کا فاسد مواد نکالنے میں تساہل برتے۔

نام نہاد علماء صرف اعمال ظاہری کو اہم بتلاتے ہیں ان سڑک چھاپ حکیموں کی طرح جو ظاہری بدن پر لیپ تجویز کرتے ہیں۔

---

[1] احیاء العلوم۔ (اردو، دیوبند) ج ۱، ص ۶۱

علمائے آخرت باطن کی صفائی کے طریقے بتلاتے ہیں اس طرح کہ شر
کی جڑیں اکھڑ جائیں....

اس لیے :-

اگر آخرت کی نجات مقصود ہے اور ابدی ہلاکت سے بچنا منظور ہے تو
باطنی بیماریوں کے علاج کی طرف دھیان دو۔[1]

اس طرح صوفیہ کرام نے دین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

(۱) شریعت، جس میں ظاہری اعمال اور ان کی اصلاح اور دنیاوی معاملات سے متعلق قوانین و ہدایات ہیں۔

(۲) طریقت[2] اکابر صوفیہ کا مرتب کردہ دستور العمل جس کے ذریعہ اصلاح باطن اور تصفیہ قلب اور آخرت کی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین کر دی کہ نجات اور اُخروی کامیابی کے لیے صرف شریعت پر عمل کرنا کافی نہیں ہے، کیونکہ اصلاح باطن سے متعلق احکام نہ تو شریعت میں ہیں نہ علماء و فقہاء ان سے واقف ہیں۔[3]

---

[1] احیاء علوم الدین (اردو۔ دیوبند) ج ۱، ص ۱۰۴، ۱۰۵

[2] شیخ یحییٰ منیری نے یہ بات اس طرح واضح کی ہے۔

ظاہری طہارت، ظاہری تہذیب سے جس امر کو تعلق ہے وہ شریعت ہے اور تزکیہ باطن اور تصفیہ قلب سے جس کو لگاؤ ہے وہ طریقت ہے۔ کپڑے کو دھو کر ایسا پاک بنا لینا کہ اسے پہن کر نماز پڑھ سکیں یہ فعل شریعت ہے، اور دل کو پاک رکھنا کدورات بشری سے، یہ فعل طریقت ہے۔ مکتوبات صدی، ۸۲ (تصوف، ۱۳۲)

[3] بقول امام غزالی: جو چیزیں آخرت میں مفید ہوں گی وہ فن فقہ سے متعلق نہیں ہیں........ فقہائے دنیا کی نظر دنیا کی بہتری پر ہوتی ہے اور علمائے آخرت (صوفیہ) کی نظر آخرت کی بہتری پر۔ چنانچہ اگر کسی فقیہ سے توکل یا اخلاص کے متعلق پوچھا جائے، یا یہ سوال کیا جائے کہ ریا سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ تو وہ اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کرے گا۔

(احیاء العلوم، ج ۱/ ۶۱، ۶۷)

یہ بات بھی سمجھا دی کہ شریعت سے زیادہ طریقت کا علم ضروری ہے یعنی طریقت شریعت سے افضل ہے[1]

رہا یہ سوال کہ جب شریعت یا اسلامی فقہ کی تدوین قرآن و حدیث ہی کی روشنی میں ہوئی ہے تو کیا اصلاح باطن اور تصفیہ قلب سے متعلق احکام قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہیں جنھیں علماء و فقہاء شریعت میں شامل کر لیتے؟ اگر ان دونوں ماخذ میں بھی نہیں ہیں تو پھر وہ کون سا ماخذ ہے جہاں سے باطنی معاملات کا علم حاصل ہوا یا ہو سکتا ہے؟

اس بارے میں صوفیہ کرام نے کیا فرمایا ہے بہتر ہوگا اگر ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں، شاہ ولی اللہ صاحب نے صوفیہ کے نقطۂ نظر کی ترجمانی اس طرح کی ہے:۔

> دین محمدی کی دو حیثیتیں ہیں: ایک ظاہری اور دوسرے باطنی جہاں تک دین کی ظاہری حیثیت کا تعلق ہے اس کا مقصود مصلحت عامہ کی نگہداشت ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ وہ احکام و معاملات جو اس مصلحت عامہ کے لیے بطور ذرائع اور اسباب کے ہیں ان کا قیام عمل میں لایا جائے اور ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے اور جن چیزوں سے مصلحت عامہ پر زد پڑتی ہو اس کو سختی سے روکا جائے۔ یہ تو ہوئی دین کی ظاہری حیثیت۔ اب رہا اس کی باطنی حیثیت کا معاملہ تو نیکی اور طاعت کے کاموں سے دل پر جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت کا مقصود اور نصب العین ہے.... وہ بزرگ جن کو خدا کی طرف سے حفاظت شریعت کی استعداد ملی تھی وہ تو دین کی ظاہری حیثیت کے محافظ بنے۔ یہ فقہاء، محدثین، غازیوں اور قاریوں کی جماعت ہے۔ دین کی تحریف میں اگر کہیں سے کوشش ہوتی ہے تو یہ لوگ اس کی تردید میں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور تعلیم و ترغیب کے ذریعہ مسلمانوں کو علوم دین کی تحصیل کی طرف متوجہ کرتے ہیں......

---

[1] امام صاحب فرماتے ہیں کہ اگر فقہ کا موازنہ علم طریق آخرت (یعنی صوفیہ کے علم) سے کیا جائے تو ثانی الذکر افضل ہے۔ احیاء العلوم ج ۱ ص ۶۳

دین کے محافظین کا دوسرا گروہ وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے باطنِ دین کی حفاظت کی۔ طاعت اور نیکوکاری کے اعمال سے باطنِ نفس میں جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور دلوں کو ان سے جو لذت ملتی ہے، یہ بزرگ لوگوں کو ان امور کی دعوت دیتے ہیں۔[1]

ان دونوں گروہوں کے مآخذِ علم کی نشان دہی اس طرح کی ہے:

اللہ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں: ایک قسم تو وہ ہے جس کی وحیِ الٰہی اور تعلیمات انبیاء نے تلقین فرمائی..... اور دوسری وہ ہے جسے الہام اور معارفِ اولیاء نے متعین کیا ہے۔[2]

دوسرے الفاظ میں:

خدا رسیدگی کے دو راستے ہیں: ایک راستہ تو وہ ہے جو نبی کے واسطہ سے خلق تک پہنچا..... دوسرا وہ ہے جو اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان ہے..... اصلاً اس طریقہ میں کوئی بھی درمیانی واسطہ نہیں ہے۔[3]

صوفیہ کرام نے جس علم کو "علمِ آخرت" یا دل کی کیفیات کے علم سے تعبیر کیا ہے اس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ الہام حاصل ہوتا ہے (قرآن وحدیث سے نہیں)۔ اس علم کو "علمِ مکاشفہ" اسی لیے کہا جاتا ہے، اور چونکہ اس کا تعلق باطن سے ہے اس لیے اسے "علمِ باطن" بھی کہتے ہیں۔ امام غزالی نے اس پر کافی تفصیلی کلام کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اس علم (یعنی علمِ مکاشفہ) کا نام علمِ باطن بھی ہے۔ یہ علم دوسرے علوم کی غایت اور منتہا ہے..... یہ علم صدیقین اور مقربین کا علم ہے۔

علمِ مکاشفہ ایک نور کا نام ہے۔ جب دل برائیوں سے پاک وصاف ہوتا ہے تو یہ نور ظاہر ہوتا ہے۔ اس نور سے آدمی پر ایسی بہت سی باتیں

---

[1] ہمعات ص ۲

[2] التفہیمات الالٰہیہ، ص ۲۸

[3] فیوض الحرمین، ص ۵۰ (تصوف، ۱۳۲، ۱۳۳-۱۳۴، ۱۳۷-۱۳۸) ۱۴۴

منکشف ہوتی ہیں جن کا وہ پہلے نام سنا کرتا تھا ..... یہاں تک کہ اسے خدائے پاک کی ذات، اس کی دائمی صفاتِ کمال ..... نبوت اور نبی کے معنیٰ، وحی ملائکہ اور شیاطین کی حقیقت، انسان سے شیطانی قوتوں کی دشمنی کی کیفیت .... دل اور اس میں فرشتوں اور شیطانوں کی جنگ کی کیفیت، فرشتے کے الہام والقاء اور شیطان کے وسوسوں کا فرق، آخرت، جنت، دوزخ .... اور دوسرے بے شمار امور کی صحیح معرفت اسی نور سے حاصل ہوتی ہے۔

علم مکاشفہ سے ہم وہی علم مراد لے رہے ہیں جس کی مدد سے یہ امور منکشف ہوجائیں، اور حق واضح ہوجائے، اتنا واضح ہوجائے گویا آنکھوں سے مشاہدہ کیا جارہا ہو..... لیکن یہ اسی وقت ہے جبکہ اس کے آئینہ خانۂ دل پر دنیاوی آلائشوں کے زنگ کی تہیں نہ جمی ہوئی ہوں۔

علم طریق آخرت سے ہم ہی علم مراد لیتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ آئینۂ دل سے ان آلائشوں کا زنگ کس طرح صیقل کیا جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، اور افعال کی معرفت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

دل کا آئینہ اسی وقت صاف شفاف ہوسکتا ہے جب انسان شہوتوں سے باز رہے اور ہر معاملے میں انبیاء علیہم السّلام کی اتباع کرے.... مگر اس عمل کے لیے بھی ریاضت اور تعلیم ضروری ہے......

یہ وہ علم ہے جو کتابوں میں نہیں لکھا جاتا جس شخص کو اللہ تعالیٰ اس علم کا کچھ حصہ عطا کر دیتا ہے وہ اس کا ذکر دوسروں سے نہیں کرتا، البتہ ان سے ضرور کہہ دیتا ہے جو اس کے اہل ہوں۔ وہ اس کے شریکِ راز ہوتے ہیں[1]

اس علم کے دروازے صرف اولیاء کرام یعنی اکابر صوفیہ پر ہی کھلتے ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ ان سے بلاواسطہ کلام فرماتا ہے اس لیے ان پر جو کچھ الہام یا منکشف ہوتا ہے وہ حق ہی

---

[1] احیاء العلوم، ج ۱، ص ۶۴-۶۵

ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کی غلطی یا شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ شیخ ہجویری فرماتے ہیں:

(وہ) خداوند تعالیٰ کے اولیاء ہیں جنھیں دوستی اور ولایت سے خاص گردانا گیا ہے..... اور طبعی آفتوں سے انھیں پاک گردانا گیا ہے اور نیز نفس اور ہوا کی پیروی سے اُن کو خلاصی دی ہوئی ہے[1]

گویا یہ بھی انبیاء کی طرح پاک اور معصوم ہوتے ہیں اور ان کے بیانات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان بزرگوں کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی وسعت کا اندازہ حضرت شبلی کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے:

کسی تاریک رات میں سخت چٹان پر اگر کوئی سیاہ چیونٹی رینگے اور میں اس سے واقف یا باخبر نہ ہوں تو یہ کہوں گا میرے ساتھ دھوکا کیا گیا[2]

شاہ ولی اللہ صاحب اپنے بڑے چچا شیخ ابوالرضا محمد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے:

بخدا اگر زمین کے نچلے طبق میں ایک چیونٹی ہو اور اس کے دل میں سو خیالات آئیں تو اس کے ننانوے خیالات کو میں جانتا ہوں، اور حق تعالیٰ سو کے سو کو جانتا ہے[3]

اس کے علاوہ ان بزرگوں کو غیر معمولی طاقت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ایک بزرگ ابراہیم الدسوقی کا بیان ہے:

جب میں چھ برس کا تھا تو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمان کی پہنائیوں میں ہے اس کا مجھے مشاہدہ کرایا جب میں آٹھ سال کا ہوا تو میں نے لوح محفوظ کو دیکھ کر اس کا اندازہ کر لیا اور جب نو سال کی عمر کو پہنچا تو آسمان کے طلسم کو میں نے توڑ دیا اور جب چودہ برس کی میری عمر ہوئی تو میں نے سبع مثانی میں ایک مبہم غیر معرب کلمہ دیکھا جس میں جملہ جن وانس حیران و سرگرداں تھے میں نے اسے سمجھ لیا اور اس کی معرفت پر اللہ تعالیٰ کا

---

[1] کشف المحجوب، ۲۶۴

[2] شطحات الصوفیہ، ج ۱، صہ ۴۴ (تصوف، ۱۴۹)

[3] انفاس العارفین، ۹۵ (تصوف، ۱۵۰)

شکر ادا کیا۔ جو ساکن تھا میں نے اسے حرکت دی، اور جو متحرک تھا میں نے
اسے خدا کے حکم سے ساکن بنایا اور اللہ رب العالمین کا شکر ہے۔[1]

تصوف میں اولیاء کی پوزیشن تقریباً وہی ہے جو شیعیت میں ائمہ کی ہے۔ انھیں بھی لامحدود علم کے ساتھ اسی نوع کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ سے منسوب روایت ہے:

ہمارے رب نے ہمیں "اسم اعظم" کا علم دیا ہے جس کی وجہ سے اگر ہم چاہیں تو آسمان وزمین اور جنّت وجہنم کے ٹکڑے کردیں۔ اسی کی طاقت سے ہم آسمان پر چڑھتے اور زمین پر اترتے ہیں، مشرق ومغرب کا سفر کرتے ہیں یہاں تک کہ عرش الٰہی تک پہنچ جاتے ہیں اور اللہ کے روبرو اس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر وہ ہم کو تمام چیزیں عطا فرمادیتا ہے یہاں تک کہ آسمان وزمین، شمس وقمر، ستارے، پہاڑ، درخت، راستے، سمندر اور جنت دوزخ بھی۔[2]

آپ نے ملاحظہ فرمایا، تصوّف اور شیعیت میں کتنی مشابہت ہے۔

(۱) شیعوں نے اہل سنت کی مرتب شریعت کو "ناقابل اعتبار" ٹھیرا کر رد کردیا، صوفیہ نے اسے ناکافی قرار دے کر اس کا کچھ ہی حصہ قبول کیا۔

(۲) شیعہ علماء کا کہنا ہے کہ رسول کے دو منصب ہوتے ہیں، بہ حیثیت رسول دین کے ظاہری پہلو سے متعلق احکامات بندوں تک پہنچانا؛ دوسرا دین کے باطنی پہلو اور اسرار دین کے علم سے صرف مخصوص لوگوں کو آشنا کرنا۔ صوفیہ کا بھی یہی کہنا ہے۔

(۳) شیعوں کے نزدیک رسولوں کے وارث ائمہ ہوتے تھے جو علم ظاہر وعلم باطن کے امین ہوتے تھے۔ ان کا منصب بالخصوص باطنی علم کی مخصوص لوگوں کو تعلیم دینا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ آپ کے اس علم کے وارث ہوئے اور ان ہی سے یہ سلسلہ آگے چلا۔ صوفیہ کرام کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

(۴) قرآن وحدیث کے علم کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مخصوص علم

---

[1] الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص۱۸۳ (تصوف، ۱۵۰)

[2] شیعی اسلام، ۱۵۰۔

بذریعہ الہام بھی ائمہ کو حاصل ہوتا رہا ہے۔ صوفیہ کرام بھی اولیاء کے بارے میں یہی کہتے ہیں[۱]

(۵) شیعہ عقیدے کے مطابق ائمہ معصوم ہیں، لہٰذا دین کے بارے میں وہ جو ہدایت دیں وہ صحیح ہیں ان کے قول کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں، وہ خود سند ہیں۔ صوفیہ کرام کا بھی اولیاء کے بارے میں یہی عقیدہ ہے کہ وہ خطا سے پاک اور خود سند ہیں[۲]

صوفیاء کے مشہور ائمہ اور مشائخ کا تعلق شیعیت سے

یہ بھی کتنا عجیب "اتفاق" ہے کہ شیعہ جن حضرات کو امام مانتے ہیں صوفیہ بھی تصوف میں انھیں امام و پیشوا مانتے ہیں؛ ان کے بارے میں جو عقیدہ شیعوں کا ہے قریب قریب وہی صوفیہ کا ہے، شیعہ علماء کا دعویٰ ہے کہ ائمہ اہل بیت کے علوم کے وارث ہم ہیں اور صوفیاء کہتے ہیں کہ ہم ہیں، ان ائمہ سے جتنی عقیدت شیعوں کو ہے صوفیاء کرام کو اس سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

شیعہ حضرات حضرت علیؓ کو اپنا سب سے پہلا امام مانتے ہیں۔ صوفیاء بھی ان ہی کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ شیخ علی ہجویری لکھتے ہیں کہ:۔

> حضرت علیؓ مصیبت کے دریا کے غریق اور محبت کی آگ کے حریق اور تمام اولیاء اور اصفیاء کے مقتدا (ہیں) آپ کی اس راستے میں بہت بڑی شان ہے اور بہت ہی بڑا درجہ ہے اور حقیقت کے اصول کی عبارتوں کی توضیح کرنے میں بے نظیر ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی شان میں حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ اصول اور مصیبتوں میں علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ یعنی ہمارے امام معاملات اور طریقت کے علم میں علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ہیں...... پس اہل طریقت کے لیے لازمی ہے کہ عبارات کی حقیقتوں اور اشارات کی باریکیوں اور دنیا و آخرت

---

[۱] مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

[۲] شیخ ہجویری فرماتے ہیں پس خداوند تعالیٰ نے برہان نبوی کو آج کے دن تک باقی رکھا اور اولیاء اللہ کو اس کے اظہار کا سبب گردانا ہے تاکہ ہمیشہ خدا کی آیتیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیلیں ظاہر ہوں۔ کشف المحجوب ج ۱ ص ۵۸-۵۹

کی تجرید اور خدا کی تقدیر کے نظارہ میں اس کی اقتدا کریں ...

دوسرے امام حضرت حسنؓ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> آپ کی اس طریقہ میں نظر کامل تھی اور اس معنیٰ کی عبارتوں کے دقائق میں آپ کو حظ وافر ملا ہوا تھا۔

شیخ علی ہجویری نے خواجہ حسن بصری کا ایک خط حضرت حسنؓ کے نام نقل کیا ہے جس میں خواجہ صاحب حضرت حسنؓ سے خطاب کرتے ہیں کہ تم

> علم اور دین کے امام ہو۔ جو شخص تمہاری فرماں برداری کرے گا نجات پائے گا۔ آپ کا علم اللہ عزوجل کی تعلیم سے ہے اور آپ کا محافظ اللہ عزّوجلّ ہے اور آپ اللہ عزّوجلّ کے حکم سے مخلوقات کے محافظ ہیں

تیسرے امام حضرت حسینؓ کو خراج عقیدت اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

> آپ شاندار اولیاء سے ہیں اور اہل بلا کے قبلہ ہیں اور کربلا کے قتیل ہیں اور اہلِ طریقت ان کے حال کی درستی پر اتفاق رکھتے ہیں۔

چوتھے امام حضرت زین العابدین کی شان میں کہا گیا ہے۔

> نبوت کے وارث اور امت کے چراغ اور سردار مظلوم اور امام مرحوم اور بندوں کی زینت اور اوتادوں کی شمع ہیں اور نیز تمام زمانہ کے لوگوں سے زیادہ عبادت کرنے والے ہیں۔ آپ حقائق کے کشف اور باریکیوں کے بیان کرنے میں مشہور ہیں۔

پانچویں امام حضرت باقر کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

> آپ معاملات کی حجت اور ارباب مشاہدہ کے برہان اور نبیؐ کی اولاد کے امام اور علیؓ کی نسل سے برگزیدہ ہیں۔ آپ علوم کی باریکیوں اور خدا تعالیٰ کی کتاب کے لطیف اشاروں کے بیان کرنے میں مخصوص تھے۔ آپ کی کرامات مشہور ہیں۔

چھٹے امام جعفر صادق کو خراجِ عقیدت اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

> اور ان اہل بیت سے سنت کا یوسف اور طریقت کا جمال اور معرفت کا معبّر اور تصوف کا آراستہ کرنے والا..... آپ بلند حال اور نیک سیرت

ہوئے ہیں... نیز طریقت کے بیان میں آپ کی کتابیں مشہور رہیں[۱]
خواجہ عطار نے تو اپنی کتاب کی ابتدا ہی امام جعفر الصادق کے ذکر سے کی ہے اور بارہ اماموں سے اپنی دلی عقیدت کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں:

آپ کے مناقب اور کرامتوں کے متعلق جو کچھ بھی تحریر کیا جائے بہت کم ہے۔ آپ امتِ محمدی کے لیے صرف بادشاہ اور حجت نبوی کے لیے روشن دلیل ہی نہیں بلکہ صدق و تحقیق پر عمل پیرا۔ اولیاء کرام کے باغ کا پھل، آلِ نبی، نبیوں کے سردار کے جگر گوشے اور صحیح معنوں میں وارث نبی بھی ہیں اور آپ کی عظمت و شان کے اعتبار سے ان خطابات کو کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہا جا سکتا۔

آپ کا درجہ صحابۂ کرام کے بعد ہی آتا ہے لیکن اہلِ بیت میں شامل ہونے کی وجہ سے نہ صرف باب طریقت ہی میں آپ سے ارشادات منقول ہیں بلکہ بہت سی روایات بھی مروی ہیں.... جو لوگ آپ کے طریقہ پر عمل پیرا ہیں وہ بارہ اماموں کے مسلک پر گامزن ہیں کیونکہ آپ کا مسلک بارہ اماموں کی طریقت کا قائم مقام ہے۔ اور اگر صرف تنہا آپ ہی کے حالات و مناقب بیان کر دیئے جائیں تو بارہ اماموں کے مناقب کا ذکر تصور کیا جائے گا۔

آپ نہ صرف مجموعۂ کمالات اور پیشوائے طریقت کے مشائخ ہیں بلکہ اربابِ ذوق اور عاشقانِ طریقت اور زاہدانِ عالی مقام کے مقتدا بھی ہیں۔ نیز آپ نے اپنی بہت سی تصانیف میں رازہائے طریقت کو بڑے اچھے پیرائے میں واضح فرمایا ہے۔

کسی کو خواجہ حضرت حسن بصری صاحب کے اس بیان سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ شیعہ ہیں، اس کی آگے وضاحت کر دی ہے کہ موصوف کا تعلق سُنّی مسلک سے ہے۔

---

[۱] کشف المحجوب، ۸۴-۹۹ دوسرے ائمہ کا ذکر مصنف نے اس لیے نہیں کیا کیونکہ کتاب متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

> مجھے ان کم فہم لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ اہل سنت نعوذ باللہ اہل بیت سے دشمنی رکھتے ہیں۔ جب کہ صحیح معنوں میں اہل سنت ہی اہل بیت سے محبت رکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے عقائد ہی میں یہ شے داخل ہے کہ رسول خدا پر ایمان لانے کے بعد ان کی اولاد سے محبت کرنا لازم ہے۔[1]

"ائمہ اہل بیت" کے علاوہ صوفیہ کو صحابہ کرام میں سے اصحاب صفہ سے کچھ زیادہ ہی عقیدت ہے اور ان ہی کی پیروی کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔

شیخ سہروردی اصحاب صفہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ تقریباً چار سو مرد تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کا کوئی کنبہ نہ تھا وہ سب مسجد نبوی میں (ایک چبوترے پر) رہتے تھے جیسا کہ صوفیا خانقاہوں میں رہتے ہیں۔ یہ اصحاب صفہ نہ زراعت کرتے تھے نہ دودھ دینے والے مویشی رکھتے تھے نہ تجارت کرتے تھے۔ وہ دن کو ایندھن جمع کرتے اور گٹھلیاں پھوڑتے، رات کو عبادت کرتے قرآن مجید سیکھتے اور اس کی تلاوت کرتے تھے۔[2]

نظامی صاحب نے اس پر اتنا اضافہ کر کے کہ:

> زیادہ تر ان بزرگوں کی گذر اوقات صدقات پر ہوتی تھی۔ یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

> اصحاب صفہ کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ رسول اکرم صلعم عبادت میں ہمہ وقت انہماک کو ایک خاصہ طبقہ کے لیے برا نہیں سمجھتے تھے۔[3]

اس طرح صوفیہ کرام کے لیے صدقات پر گذر اوقات کا جواز تو نکل آیا لیکن اس سے اہم اور قابل تحقیق بات یہ ہے کہ اگر اصحاب صفہ کو "دنیاوی معاملات سے .... کوئی سروکار نہ تھا" تو کیوں؟

کیا اُس "حلقہ" میں شامل ہونے سے پہلے ان حضرات کے چمکتے ہوئے کاروبار تھے جنھیں "عبادت میں رکاوٹ" سمجھ کر انھوں نے ترک کر دیا تھا یا چاہتے تو تجارت و زراعت کر سکتے تھے لیکن انھوں نے "صدقات" پر ہی گذر اوقات کو ترجیح دی؟ اگر ان میں سے

---

[1] خواجہ صاحب نے امام جعفر صادق کے اور بھی بہت سے مناقب کئی صفحات میں بیان کیے ہیں۔
[2] عوارف ص ۱۰۳، [3] مشائخ چشت ص ۵۶، ۵۸ [4] ایضاً ص ۵۷

کوئی بات بھی صحیح ہوتی تو شیخ ہجویری، شیخ سہروردی اور پروفیسر صاحب کا استدلال و استنباط صحیح ہوسکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ وہ بات قرین قیاس اور تاریخی اعتبار سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے جو امام ابن تیمیہؒ نے فرمائی ہے کہ

> صفہ مسجد نبوی میں ان غیر مستطیع اور نادار مہاجرین کے لیے بنایا گیا تھا جن کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا اور نہ مدینہ میں ان کے اعزہ واقارب ہی رہتے تھے جن کے یہاں وہ قیام کرتے۔ ہجرت کے ابتدائی دنوں میں ایسے ہی ہنگامی حالات تھے۔ بعد میں جن لوگوں کو کہیں جائے رہائش مل جاتی تھی وہ صفہ چھوڑ دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی[1] ..... جب مسلمانوں کو فتح ونصرت ملی اور فراوانی آئی تو انھوں نے صفہ چھوڑ دیا اور ان میں سے بعض صاحب جائداد بھی ہو گئے ......
>
> ان کی غربت اور تنگ حالی اگر اختیاری ہوتی اور انھوں نے ارادۃً ایسا کیا ہوتا تو ان کے متعلق " لا یستطیعون ضربًا فی الارض" کہہ کر ان کی عدم استطاعت کو ظاہر نہ کیا جاتا (البقرہ: ۲۷۳)
>
> مہاجرین میں سے خلفاء راشدین اور حضرت طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور گروہ انصار میں سے ایک فرد بھی اس سے متعلق نہ تھا[2]

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ صوفیہ نے اصحاب صفہؓ میں سے جن حضرات کا بطور نمونہ انتخاب کیا ہے ان کا شمار اساطین شیعیت میں ہوتا ہے، یعنی حضرت ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ، عمارؓ اور مقدادؓ۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی تعریف میں شیخ ہجویری نے لکھا ہے کہ یہ زہد میں عیسیٰؑ صفت اور شوق میں موسیٰؑ صفت تھے۔ تاریخ طبری سے اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ دولت جمع کرنے کے معاملے میں تمام صحابہ سے انھیں اختلاف تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ شرعی مطالبات ادا کرنے کے بعد بھی کسی کو دولت اپنے پاس نہیں رکھنی چاہیئے۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں سمجھایا کہ حکومت لوگوں کو اس سلسلے میں مجبور نہیں کرسکتی تو انھوں نے مدینہ سے باہر ایک مقام (ربذہ) میں

---

[1] الفرقان بین اولیاء الرحمٰن واولیاء الشیطان، ص ۳۰ (تصوف ۱۶) [2] تصوف، ص ۱۷-۱۶

سکونت کی اجازت مانگی جو انھیں دے دی گئی اور یہ وہاں سکونت پذیر ہو گئے جہاں ان کا وظیفہ انھیں ملتا رہا۔[1]

شیعہ حضرات کو ان سے عقیدت اس لیے ہے کہ ان کے نزدیک حضرت ابوذر رضؓ کے حضرت عثمان رضؓ اور حضرت معاویہؓ سے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے تھے اور حضرت عثمان رضؓ نے انھیں مدینہ چھوڑنے پر مجبور کیا اور ربذہ بھیج دیا۔ حضرت علی رضؓ نے، باوجود اس کے کہ حضرت عثمان نے منع کر دیا تھا، حضرت ابوذر رضؓ کو رخصت کیا اور اپنے دو صاحبزادوں کو بھی ہدایت کی کہ انھیں ربذہ تک چھوڑ آئیں۔[2] حضرت ابوذر رضؓ کا حضرت عثمان رضؓ اور امیر معاویہؓ سے اختلاف ہی ان کی شیعہ حلقے میں مقبولیت کا سبب بن گیا۔

حضرت سلمان فارسی رضؓ کو شیخ ہجویری نے "خداوند کریم کا دوست اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کا محرم" بتایا ہے اور شیعوں کو ان سے عقیدت اس وجہ سے ہے کہ خلافت کے معاملے میں انھوں نے حضرت ابوبکر رضؓ کی مخالفت اور حضرت علی رضؓ کی حمایت کی تھی، نیز ان کا تعلق ایران سے تھا۔

حضرت عمار بن یاسر رضؓ کے بارے میں شیخ ہجویری نے صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ "اصحاب اور ارباب زینت" کے برگزیدہ تھے۔ لیکن شیعہ حلقے میں ان کی شہرت و مقبولیت کا ایک سبب تو یہ تھا کہ یہ حضرت عثمان رضؓ کے سخت مخالف اور حضرت علی رضؓ کے حامی تھے، دوسرا اور زیادہ اہم سبب وہ حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ عمار بن یاسر رضؓ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ اسی بنا پر سنی حضرات نے انھیں معیار حق و باطل بنا لیا ہے۔ یہ جنگ صفین میں حضرت علی رضؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے قتل ہوئے تھے اس لیے کہا جاتا ہے کہ چونکہ حضرت امیر معاویہ رضؓ کی فوج نے انھیں قتل کیا اس لیے وہ باغی ہوئے اور حضرت علی رضؓ حق پر تھے۔ اس حدیث نے شیعوں کی نظر میں حضرت عمار رضؓ کا مقام یقیناً بہت بلند کر دیا۔

شیعیت کے چوتھے ستون حضرت مقداد بن اسود رضؓ کے بارے میں شیخ ہجویری کا کہنا ہے کہ یہ تنہائی کے راستے کے سالک اور ذلت اور عیبوں سے منہ پھیرنے والے تھے۔ ان کا تصوف سے کیا تعلق یہ تو صوفیہ ہی سمجھ سکتے ہیں البتہ شیعوں کی عقیدت کا سبب ظاہر ہے، یہ کہ حضرت عثمان رضؓ کے مقابلے میں، یہ حضرت علی رضؓ کی خلافت کے حامی تھے۔ ان حضرات کے علاوہ حضرت بلال رضؓ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ شیخ ہجویری نے ان کے بارے

---

[1] طبری ج ۳ صد ۳۴۱-۳۴۳ [2] دیکھئے، اثنا عشری، صد ۷۱، ۷۲

میں صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ خدائے جبار کی بارگاہ کے برگزیدہ منادی ہیں۔ شیعوں کو ان سے عقیدت اس بنا پر ہے کہ انھوں نے (اگرچہ حضرت علیؓ کی حمایت نہیں کی لیکن کم ازکم) حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے انکار کر دیا تھا[1]

اس سلسلے میں حذیفہ بن الیمانؓ کا نام بھی لیا گیا ہے[2]۔ شیعوں کے نزدیک انھوں نے حضرت علیؓ سے فیض حاصل کیا تھا اور حضرت علیؓ کے خلیفہ ہو جانے پر اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی کہ حضرت علیؓ کی حمایت کریں[3]۔

تابعین میں شیخ ہجویری نے حضرت اویس قرنی کو سرفہرست رکھا ہے اور خواجہ عطار نے امام جعفر صادق کے بعد ہی ان کا ذکر کیا ہے۔

شیخ ہجویری کے نزدیک یہ "امت کے آفتاب اور دین وملت کی شمع" اور مشائخ تصوف کے اہل کبار سے ہوئے ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے "مگر زیارت سے روکے گئے تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ کہیں حضور کے دیدار کے غلبۂ شوق سے ہلاک نہ ہو جائیں اور دوسری وجہ والدہ کی خدمت کے حق کی بجا آوری منظور تھی"۔ شیخ صاحب نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اویس قرنی قیامت کے روز قبیلہ ربیعہ اور مضر کی بھیڑوں کے بالوں کے بقدر اس امت کے اشخاص کی شفاعت کریں گے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت عمرؓ اور علیؓ ان سے ملاقات کریں گے۔ آپ نے ان دونوں کو ہدایت فرمائی کہ جب ملاقات ہو تو آپ کا سلام پہنچائیں اور کہیں کہ اس امت کے لیے دعا کریں۔ نیز اپنا پیراہن بھی عطا فرمایا کہ یہ انھیں دے دیں۔

اپنے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ ان سے ملے، پیغام پہنچایا اور پیراہن بھی دیا۔ آگے کیا ہوا، خواجہ عطار کے الفاظ میں سنئے[4]

---

[1] اثنا عشری ص۵۷ [2] مشائخ چشت ص۵۷ [3] اثنا عشری، ص۷۴، ۷۵

[4] روایت کی صحت کا ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اسے حضرت خواجہ عطار بیان فرما رہے ہیں۔ اہل تصوف اور بہت سے مورخوں نے ان کی کتاب کو مستند سمجھ کر یہ باتیں نقل کی ہیں۔ اس کی تائید کسی رخ سے قرآن وحدیث سے نہیں ہوتی۔

حضرت اویس نے حضورؐ کا لباس مبارک کچھ فاصلے پر لے جاکر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یارب جب تک تو میری سفارش پر امت محمدی کی مغفرت نہ کر دے گا میں سرکار دو عالم کا لباس ہرگز نہیں پہنوں گا کیونکہ تیرے نبی نے اپنی امت کو میرے حوالے کیا ہے۔ چنانچہ غیب کی آواز آئی کہ ہم نے تیری سفارش پر کچھ افراد کی مغفرت کر دی۔ لیکن آپ نے پھر عرض کیا کہ پورے امت کی مغفرت فرما دے۔ جواب ملا کہ ہم نے ایک ہزار افراد کی بخشش کر دی۔ اس طرح آپ مشغول دعا تھے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ آپ کے سامنے پہنچ گئے اور جب آپ نے سوال کیا کہ آپ دونوں حضرات کیوں آ گئے ہیں تو جب تک پوری امت کی مغفرت نہ کروالیتا اس وقت تک یہ لباس کبھی نہ پہنتا۔

بعد میں انھوں نے لباس پہنا اور فرمایا کہ بنو ربیعہ اور بنو مضر کے قبیلوں کی بھیڑوں کے بالوں کے بقدر لوگوں کی اللہ نے مغفرت فرمادی۔ خواجہ صاحب نے حضرت عمرؓ اور حضرت اویس قرنی کی گفتگو کا جس طرح ذکر کیا ملاحظہ فرمائیں:۔

حضرت عمرؓ نے آپ کو ایسے کمبل کے لباس میں دیکھا جس کے نیچے تونگری کے ہزاروں عالم پوشیدہ تھے۔ یہ دیکھ کر آپ کے قلب میں خلافت سے دست برداری کی خواہش پیدا ہوئی اور فرمایا کہ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو روٹی کے ٹکڑے کے بدلے میں مجھ سے خلافت خرید لے۔ یہ سُن کر حضرت اویس نے کہا کہ کوئی بے وقوف شخص ہی خرید سکتا ہے۔ آپ کو تو فروخت کرنے کے بجائے اٹھا کر پھینک دینا چاہیے پھر جس کا جی چاہے اٹھا لے۔

یہ تو ہوئی خلافت کی خرید و فروخت کی بات۔ آگے دیکھیں۔

اور جب حضرت عمرؓ نے آپ سے حضور اکرمؐ کی زیارت نہ کرنے کے متعلق سوال کیا تو آپ نے ان سے پوچھا کہ اگر آپ دیدار نبیؐ سے مشرف ہوئے ہیں تو بتایئے کہ حضورؐ کے ابرو کشادہ تھے یا گھنے؟

لیکن دونوں صحابہ جواب سے معذور رہے۔

حضرت اویس نے کہا کہ اگر آپ رسول کریمؐ کے دوستوں میں سے ہیں تو یہ بتائیے کہ جنگ احد میں حضورؐ کا کون سا دندان مبارک شہید ہوا تھا، اور آپ نے اتباع نبوی میں اپنے تمام دانت کیوں نہ توڑ ڈالے؟ یہ کہہ کر اپنے تمام ٹوٹے ہوئے دانت دکھا کر کہا کہ جب دانت مبارک شہید ہوا تو میں نے اپنا ایک دانت توڑ ڈالا پھر خیال آیا کہ شاید کوئی دوسرا دانت شہید ہوا ہو۔ اسی طرح ایک ایک کر کے جب تمام دانت توڑ ڈالے اس وقت مجھے سکون نصیب ہوا۔ یہ دیکھ کر دونوں صحابہ پر رقت طاری ہوگئی اور یہ اندازہ ہوگیا کہ پاس ادب کا حق یہی ہوتا ہے۔ گو حضرت اویس دیدار نبیؐ سے مشرف نہ ہوسکے لیکن اتباعِ رسالت کا مکمل حق ادا کرکے دنیا کو درس ادب دیتے ہوئے رخصت ہو گئے[ل]

خواجہ صاحب نے حضرت عمرؓ کی "شان" میں جو کچھ فرمایا وہی کافی تھا پھر بھی جو کمی باقی رہ گئی تھی وہ شیعہ علماء نے پوری کر دی۔

ڈاکٹر رضوی کا کہنا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے خلافت بیچنے کی بات کہی تھی تو حضرت اویس نے فرمایا تھا۔

"اسے پھینک دو، تاکہ جو حقدار ہے (اشارہ حضرت علیؓ کی طرف) وہ اسے اٹھائے"۔

ایک اور شیعہ عالم (قاضی نوراللہ شوستری) نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ اویس قرنی کا منشا (دراصل) حضرت عمرؓ کی مذمت کرنا تھا کیونکہ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے خلافت خریدی تھی اور پھر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ فروخت کر دی، قاضی نوراللہ کا یہ کہنا بھی ہے کہ حضرت عمرؓ اگر خلوصِ دل سے خلافت بیچتے تو حضرت طلحہؓ، معاویہؓ اور زبیرؓ روٹی کا ٹکڑا تو کیا اتنی جانیں

سلہ غالباً اسی قسم کے واقعات سے متاثر ہو کر پروفیسر نظامی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

شاید ہی دنیا میں کسی پیغمبر یا مذہبی رہنما کے احوال زندگی کا اتباع اُس محبت، وارفتگی اور شیفتگی کے ساتھ کیا گیا ہو جیسا کہ صوفیہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا تتبع کیا ہے۔ (مشائخ چشت ۱۱۰)

نذر کر دیتے[1]

خواجہ عطار نے اویس قرنی اور حضرت عمرؓ کے بارے میں جتنا کچھ لکھ دیا ہے وہ شیعوں کے لیے کافی تھا لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات شیخ ہجویری نے یہ لکھی ہے:

> آپ امیر المومنین علی ابن طالب کرم اللہ وجہہ کی طرف سے دوسری مدمقابل افواج کے ساتھ لڑائی کرتے رہے۔ بالآخر آپ جنگ صفین میں شہید ہوئے۔

اسی بنا پر رضوی نے محمد بن ابی بکر کے بعد ہی خواجہ اویس کا ذکر کیا ہے۔

صوفیا، کرام شیعہ علما، نظر میں

خواجہ عطار اور دوسرے صوفیہ نے اس قسم کی خدمات انجام دے کر شیعہ حلقے میں بھی خاصی مقبولیت حاصل کرلی اور اس طرح تصوف کو شیعیت سے اتنا قریب کر دیا کہ خود بعض شیعہ علما، نے کہہ دیا کہ صوفیا، کرام دراصل شیعہ ہی تھے جو معرفت الٰہی میں ڈوبے ہوئے تھے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کے اسرار (علم باطن) کے امین تھے[2] اور یہ کہ حقیقتاً شیعیت اور تصوّف میں کوئی فرق نہیں ہے[3]

---

[1] اثنا عشری، ج ۱، ص۸۳۔ یہاں قاضی نور اللہ نے "ضمناً" حضرت طلحہؓ، معاویہؓ اور زبیرؓ کا ذکر کرکے کچھ تاریخی واقعات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ یعنی خلافت کا معاملہ ہی کچھ ایسا ہے اسی کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت ہوئی، انھیں شہید کیا گیا، جنگ جمل اور جنگ صفین ہوئی اور کربلا کا بھی واقعہ پیش آیا اور ہزارہا مسلمانوں کی جانیں قربان ہوئیں۔

جہاں تک حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کا تعلق ہے تو مشہور مورخ طبری کے بیان کے مطابق جب قاتلین حضرت عثمانؓ نے ان دونوں کو خلافت پیش کی تو انھوں نے اس خلافت سے اپنی بیزاری کا اعلان کر دیا جو قاتلوں کے ذریعہ حاصل ہو۔ چنانچہ ان باغیوں اور قاتلوں نے حضرت علیؓ سے بھی یہی درخواست کی انھوں نے بھی انکار کر دیا، لیکن جب ان شرپسندوں نے حضرت علیؓ کو بھی قتل کر دینے کی دھمکی دی تو انھوں نے با دل ناخواستہ اس منصب کو سنبھال لیا۔ (طبری، ج ۴ ص۲۸-۳۲)

[2] لیکن شیعہ علما، نقش بندی صوفیہ کو اس زمرے میں شامل نہیں کرتے کیوں کہ ان کا سلسلہ حضرت ابوبکرؓ سے منسوب ہے۔ دیکھئے، اثنا عشری، ص۳۵۳

[3] شیبی اسلام، ۹۵ - ۹۶؛ اثنا عشری، ص۱۳۱، ۳۵۳

شیعہ صوفی سلسلے بھی حضرت معروف کرخی کے واسطے سے حضرت علیؓ پر ہی منتہی ہوتے ہیں۔ چونکہ صوفیہ کرام اور ان کے اصولوں کا شیعیت سے بڑا گہرا تعلق ہے، اسی بناء پر بعض شیعہ علماء کے نزدیک وہ تمام اکابر صوفیاء جنھیں عام طور پر سنی سمجھا جاتا ہے دراصل شیعہ تھے۔ مثلاً حضرت شقیق بلخی، ابراہیم بن ادہم، معروف کرخی، سری سقطی، بشر بن الحارث، ابویزید بسطامی (جو کسی نہ کسی (شیعہ) امام کے دامن سے وابستہ بھی رہے تھے) شیخ جنید بغدادی، شبلی، حسین بن منصور حلاج، ابن عربی، شہاب الدین سہروردی، غزالی، نجم الدین کبریٰ، فریدالدین عطار، رومی، حافظ شیرازی، علاء الدولہ سمنانی، میر سید علی ہمدانی، سید محمد نوربخش وغیرہم۔

یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ان میں سے اکثر مصلحتاً تقیہ کرتے تھے اور خود کو سنی ظاہر کرتے تھے اسی لیے پہلے تین خلفاء کی تعریف بھی کر دیتے تھے لیکن بعض حضرات تو اس طرح تعریف کرتے تھے کہ سنی تو یہ سمجھتے کہ تعریف کی جا رہی ہے لیکن حقیقتاً ان خلفاء کا مذاق اڑایا جاتا تھا، جیسا کہ خواجہ فریدالدین عطار نے کیا ہے[1]

پیر پرستی اور عقیدۂ ولایت و امامت

پیر پرستی کا مطلب ہے پیر کو اپنا حاکم اعلیٰ مان کر خود کو مکمل طور پر اس کے سپرد کر دینا، اس کی دل وجان سے اطاعت کرنا، سب سے بڑھ کر اس سے محبت و عقیدت رکھنا، سجدہ کی حد تک اس کی تعظیم کرنا، اسی سے ڈرنا اور اپنی تمام امیدیں اسی کے دامن اور آستانے سے وابستہ رکھنا۔ اور یہ عقیدہ بھی رکھنا کہ پیر اپنے مرید کے دل کا حال بھی جانتا ہے، اس کے احوال کا نگراں ہوتا ہے، محافظ و ناصر اور حاضر و ناظر ہوتا ہے۔ اسی کو عبادت یا پرستش کہتے ہیں۔

یہ "مسخ شدہ" تصوف کا اصول نہیں بلکہ "حقیقی تصوف" کی روح اور "ارتقاء روحانی" کا وہ راستہ ہے جو "صوفیاء خام" نے نہیں اکابر صوفیاء نے دکھایا ہے۔

---

[1] یہ کسی معمولی شیعہ عالم کا نہیں قاضی نوراللہ شوستری کا تحقیقی تجزیہ ہے۔ دیکھئے اثنا عشری ج ۱ ص ۳۵۲-۳۵۳

صوفیاء کرام نے پیر کی ضرورت پر بہت زور راس کی صحبت کو لازمی قرار دیا ہے ان کے نزدیک کسی نہ کسی پیر کے دامن سے وابستہ ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا رسول یا امام پر ایمان لانا۔

شیعہ علماء کے عقیدے کے مطابق جس نے اپنے زمانے کے امام کو نہیں پہچانا اور اس کی اطاعت نہیں کی وہ جاہلیت کی موت مرے گا[1]

اور صوفیاء کا کہنا ہے کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے[2] ان کے نزدیک شیخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہوتا ہے، شیخ سہروردی فرماتے ہیں:

> طریقۂ صوفیاء میں شیخ کا مرتبہ ایک اعلیٰ مرتبہ ہے۔ بلکہ خدائی دعوت کے سلسلے میں وہ پیغمبروں کی قائم مقامی کرتے ہیں......
>
> مشائخ خدا کے وقار کا ذریعہ ہیں اور وہی لوگوں کو ظاہری اور باطنی ادب سکھاتے ہیں.... مشائخ کو جب ہدایت حاصل ہوئی تو وہ اس بات کے مستحق ہو گئے کہ ان کی پیروی کی جائے۔ انھیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنایا گیا..... یہی وہ لوگ ہیں جن کا کلام پیغمبروں کا کلام ہے.... خرقہ پوشی میں شیخ کا ہاتھ رسول اکرمؐ کے دست مبارک کی قائم مقامی کرتا ہے[3]

یہ بات ذہن میں رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اور مکمل اطاعت و پیروی کا حکم اس بنا پر دیا گیا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں، آپ پر وحی نازل ہوئی اور یہ کہ آپ معصوم ہیں۔ صوفیاء کرام کو اس کا احساس ہے اسی لیے انھوں نے مشائخ کو بھی ان اوصاف سے متصف کر دیا ہے تاکہ مرید مکمل طور پر خود کو پیر کے سپرد کر دے چنانچہ شیخ سہروردی نے صراحت فرمادی ہے کہ شیخ کا تقرر خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

> جب مقررہ وقت آجائے تو وہ (یعنی شیخ) اپنی روحانی حالت پر قابو پالے

---

[1] شیعی اسلام، ص۱۵۸

[2] یہ قول شیخ ابو یزید کا ہے اور نقل کرنے والے شیخ شہاب الدین سہروردی۔ دیکھئے عوارف ص۱۳۵

[3] عوارف، ص ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۷

اور اللہ تعالیٰ کے ذریعہ جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مریدوں کی اصلاح
و ہدایت کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے تو اس وقت وہ ان (یعنی مریدوں)
سے اس طرح گفتگو کرے۔[1]

مرید پر اللہ کا سارا فضل شیخ کی بدولت ہوتا ہے اور شیخ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے کلام کرتا ہے:

شیخ مرید سے خرقہ پوشی کے شرائط بجا لانے کا عہد لیتا ہے اور اسے
خرقہ کے حقوق سے واقف کراتا ہے۔ لہٰذا شیخ مرید کے لیے ایک ایسی
تصویر کے مانند ہے جس کے پس پردہ مرید کو مطالبات الٰہیہ اور مقاصد
نبویہ کا عکس نظر آتا ہے اور مرید پر یہ اعتقاد راسخ ہو جاتا ہے کہ شیخ
ایک ایسا دروازہ ہے جسے خداوند تعالیٰ اپنے آستانہ کرم کی طرف
کھولتا ہے جہاں سے وہ داخل ہوتا ہے ..... شیخ کے ذریعہ ہی اس
کی تمام واردات اور تمام دینی اور دنیاوی کام انجام پاتے ہیں اور اسے یہ
یقین ہو جاتا ہے کہ اس پر خدا کا جو فضل و کرم نازل ہوتا ہے وہ شیخ
کی بدولت ہے اور وہی اس کے بارے میں خدا سے اسی طرح رجوع
کرتا ہے جس طرح کہ وہ خود شیخ کی طرف متوجہ ہے .....

شیخ ..... مرید کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خدا کے پاس
اسی طرح فریاد لے کر جاتا ہے جس طرح وہ اپنی دینی اور دنیاوی
ضروریات اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔

اور پھر پردے کے پیچھے سے کلام ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"کسی بشر کی یہ طاقت نہیں کہ وہ اللہ سے کلام کرے سوائے اس کے
کہ وہ کلام وحی ہو، یا پردے کے پیچھے ہو یا وہ کوئی قاصد بھیجے۔"

لہٰذا قاصد بھیجنا (فرشتے) اور وحی پیغمبروں اور رسولوں کے ساتھ مخصوص
ہے۔ البتہ پردے کے پیچھے بذریعہ الہام و ہاتف غیبی اور خواب وغیرہ ہیں

---

[1] عوارف ص۲۱۹   [2] ایضاً ص۱۳۸

گفتگو ہو سکتی ہے جس کے مستحق مشائخ اور جلیل القدر اہل علم ہیں۔[۱]

شیخ کی عصمت:

> شیخ مریدوں کے لیے الہام کا محافظ ہے جس طرح حضرت جبرئیل وحی کے محافظ تھے کہ وہ وحی میں خیانت نہیں کرتے تھے۔ اس طرح شیخ بھی الہام میں خیانت نہیں کرتا اور جس طرح رسول اللہؐ نفسانی خواہش کے مطابق گفتگو نہیں فرماتے تھے، اسی طرح شیخ بھی ظاہر و باطن میں آپ کی پیروی کرتا ہے اور نفسانی خواہش کے مطابق کلام نہیں کرتا...
>
> لہٰذا جب شیخ زبان سے کچھ بولتا ہے تو اس وقت اس کا نفس خوابیدہ ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی نعمتوں کے مطالعہ میں مشغول رہ کر نفسانی غلبے کے فوائد یعنی خود بینی اور خود پسندی سے محروم رہتا ہے بلکہ خود شیخ کی زبان پر حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جو کلمات صادر ہوتے ہیں، انھیں بھی وہ سامعین کی طرح غور سے سنتا ہے۔[۲]

دراصل اللہ تعالیٰ سے بلا واسطہ کلام کرنا اور یہ کہنا "حدثنی قلبی عن ربی" (میرے قلب نے مجھے بتایا جو کچھ میرے رب نے اس سے فرمایا) ایک عام بات ہے اتنی عام کہ شیخ محی الدین ابن عربی کو یہ کہنا پڑا کہ:۔

> "حدثنی قلبی عن ربی" کہنے والا باوجود بلند مرتبہ ہونے کے چونکہ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان قلب کا واسطہ رکھتا ہے اس لیے اس شخص کے علمی مقام کو نہیں پہنچ سکتا جو یہ کہنے کی پوزیشن میں ہو کہ مجھ سے میرے رب نے براہِ راست خود فرمایا۔[۳]

اس طرح شیخ کو علم باطن حاصل ہوتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ وہ مرید کی تربیت اور نگرانی کرتا ہے۔ شیخ سہروردی کے الفاظ میں:

> شیخ خداوند تعالیٰ سے صحیح نیازمندی اور حسن استقامت کے

۱۔ عوارف، ص ۱۳۸ ۲۔ ایضاً، ص ۲۰۹-۲۱۰

۳۔ الفتوحات المکیہ، اول ص ۵۷ (تصوف ص ۱۳۸)

بعد جو علم باطن حاصل کرتا ہے اس کے ذریعے وہ اس (مرید) کی تربیت
کرتا ہے اور اپنی زبردست بصیرت کے مطابق اس کے باطن کی نگرانی
کرتا ہے[۱]

جب پیر کو یہ مقام حاصل ہوگیا تو اس کی اطاعت مرید پر لازم ہو جاتی ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت لازم ہے اور ان ہی آداب کے ساتھ جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں:۔

خرقہ پوشی شیخ و مرید کے درمیان ایک قسم کا رابطہ ہے جس کے ذریعہ مرید شیخ کو اپنا حاکم تسلیم کرتا ہے جب دنیوی مسادات کے لیے شریعت میں حکم بنانا جائز ہے تو ایک منکر اس خرقہ کا کیسے انکار کرسکتا ہے جو ایک ایسے مخلص طالب حقیقت کو پہنایا جاتا ہے جو حسن ظن اور حسن عقیدت کے ساتھ شیخ کے پاس آکر اپنے مذہبی مفاد میں اسے اپنا رہبر بناتا ہے تاکہ وہ اسے راہِ ہدایت پر لائے اسے راہ فلاح کی شناخت کرائے اور بتائے کہ آفات نفس کیا ہیں، اعمال کیسے خراب ہو جاتے ہیں اور کن راستوں سے دشمن داخل ہوتا ہے[۲]

اس طرح وہ اپنے آپ کو شیخ کے حوالے کر دیتا ہے اور اس کی رائے اور مشورہ پر اپنے تمام معاملات میں سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اس لیے شیخ اس پر اپنے تصرفات باطنی کے اظہار کے لیے اسے خرقہ پہناتا ہے۔ چنانچہ خرقہ پوشی سپردگی اور تسلیم و رضا کی نشانی ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ وہ شیخ کے حکم کے ماتحت خدا اور اس کے رسول کے حکم کو تسلیم کرلے گا۔ بلکہ خرقہ کے ذریعے رسول اکرمؐ کی سنت بیعت کو زندہ کیا گیا ہے۔[۳]

---

[۱] عوارف، ص ۱۳۹ [۲] امام غزالی کے بیان کے مطابق اسلامی فقہ (شریعت) کا ان امور سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔ [۳] عوارف، ص ۱۳۵

اس احیاء سنت پر شیخ موصوف کا مزید تبصرہ:

تاہم یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس قسم کی خرقہ پوشی جس پر موجودہ زمانے میں مشائخ کا عمل ہے رسول اللہؐ کے زمانے میں نہیں تھی۔ مگر موجودہ صورت اور اس کے لیے تیار اور جمع ہونے کو مشائخ نے پسند فرمایا...... ....

بہر حال اس سے زیادہ مکمل اتباع رسولؐ اور کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کی طرف مخلوق کو دعوت دی جائے[1] خداوند تعالیٰ نے اپنے قدیم کلام (قرآن مجید) میں ذکر کیا ہے کہ تمام مسلم قوم (امت) رسول اللہؐ کو اپنا حاکم تسلیم کرے۔ لہٰذا اگر کوئی مرید اپنے شیخ کو اپنا حاکم تسلیم کرتا ہے تو وہ تحکیم نبوی کی سنت کو زندہ کرتا ہے[2]

فنا فی الشیخ کی تعلیم یوں دی گئی ہے۔

چنانچہ جب کوئی مخلص مرید شیخ کے حکم کے تابع ہو جاتا اور اس کے ساتھ رہ کر اس کے آداب اختیار کرتا ہے تو شیخ کے باطن کی روحانی طاقت مرید کے باطن میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے جس طرح ایک چراغ دوسرے چراغ سے روشن ہوتا ہے ..... یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب مرید اپنے آپ کو شیخ کے لیے وقف کر دے اور اپنے ذاتی ارادے کو چھوڑ کر قطعی طور پر شیخ کے اندر فنا ہو جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرید۔

خدا کے حضور میں پہنچ جائے گا۔ اس وقت وہ خدا کا کلام اسی طرح سمجھنے لگے گا جس طرح شیخ کے کلام کو سمجھتا تھا[3]

اس سپردگی اور اطاعت کا یہ مطلب نہیں کہ مرید شیخ کی اطاعت صرف ان امور میں

---

[1] بات دعوت کی نہیں، خرقے کی ہو رہی ہے

[2] عوارف، ص ۱۳۷ [3] ایضاً ص ۱۳۶۔

کرے جنھیں وہ کتاب وسنت کے مطابق سمجھتا ہے بلکہ اگر شیخ ایسی بات کا بھی حکم دے جو صریحًا قرآن وحدیث کے خلاف ہو تو بھی بے چون وچرا تعمیل کرے۔ چنانچہ شیخ سہروردی کا ارشاد ہے:۔

خرقہ پوشی مشایخ پر اتہامات لگانے اور اعتراض کرنے سے روکتی ہے کیونکہ یہ مریدوں کے لیے مہلک زہر ہے اور وہ مرید جو شیخ کے تصرفات باطنی پر اعتراض کرتا ہے کامیاب نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایک مرید صادق جب شیخ کے باطنی تصرفات کو نہیں سمجھ سکتا تو وہ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا قصہ یاد کرتا ہے[۱]

حضرت شبلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک شخص سے بیعت کے لیے یہ شرط رکھی ہے حضرت شبلی کے نام کا کلمہ پڑھے یعنی یہ کہے کہ شبلی رسول اللہ۔ اس نے ایسا ہی کیا۔[۲] یہ بات صریحًا قرآن وحدیث کے خلاف ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ حضرت شبلی کا مقصد مرید کے حسنِ عقیدت کا امتحان لینا تھا اس لیے حضرت شبلی نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک کیا[۳]

دراصل اس معاملے میں تصوف کا اصول ہی یہ ہے کہ:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا[۴]

بہرحال ضروری نہیں کہ مرید شیخ کے نام کا کلمہ بھی پڑھے لیکن احترام اسی طرح کرے جس

---

[۱] عوارف، ص۱۳۷ [۲] خواجہ معین الدین چشتی کے بارے میں بھی ایسی ہی "روایت" ہے۔ دیکھئے شیخ فرید الدین گنج شکر، فوائد السالکین، دہلی ۱۳۱۰ھ ص ۲۳ (تصوف ص۱۶۵)

[۳] فوائد الفواد ص ۴۳؛ سیر الاولیا، ص ۳۲۸۔ لیکن شیخ عبدالکریم جیلی نے اس کی کچھ زیادہ ہی زوردار تاویل کی ہے یعنی یہ کہ اس وقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت شبلی کی شکل میں موجود تھے (تصوف ص۱۶۵ بحوالہ شیخ عبدالکریم جیلی، الانسان الکامل، مصر ۱۳۱۶ھ دوم، ص۴۶) حضرت شبلی کے قول کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ کتنی بھیانک توجیہ ہے؛ کیا اسے کتاب وسنت کی تعلیم سے کوئی مناسبت ہے؟

[۴] وہ بات نہیں ہے جو نظامی صاحب نے یہ شعر نقل کر کے کہی ہے کہ اس شعر میں "بے راہ روی کا جواز تلاش" کیا جا سکتا ہے بلکہ اسی کی تو صوفیہ تعلیم دیتے ہیں۔

طرح کہ صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتے تھے۔ شیخ سہروردی فرماتے ہیں:

> صوفیہ کے نزدیک مشائخ کے ساتھ مریدوں کے آداب کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اس معاملے میں وہ بھی رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کے عمل کی پیروی کرتے ہیں۔

آگے شیخ صاحب نے چند مثالیں بیان کی ہیں: قرآن میں ارشاد ہے:

> اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے ..... (الحجرات)
>
> یہی طرزِ عمل مرید کا بھی ہونا چاہیئے کہ اس کا کوئی اپنا ارادہ اور اختیار باقی نہ رہے وہ اپنی ذات اور مال میں بھی شیخ کے مشورہ اور حکم کے بغیر تصرف نہ کرے ..... شیخ کے سامنے بالکل خاموش بیٹھا رہے اور ان کے روبرو کوئی اچھی بات بھی نہ کہے جب تک کہ وہ شیخ سے اجازت طلب نہ کرے اور اس طرف سے اجازت نہ ملے .....
>
> شیخ کے سامنے مرید کا یہ طرزِ عمل ہو کہ وہ تو اونچی آواز سے بولے نہ بہت ہنسے اور نہ بہت گفتگو کرے[1]

ان آداب کے علاوہ مشائخ چشت میں پیر کو سجدہ کرنے کی بھی رسم رہی ہے شیخ نظام الدین اولیاء نے اس کا جواز اس طرح دیا ہے کہ پچھلی امتوں میں بادشاہوں، استادوں اور پیغمبروں کے لیے یہ سجدہ مستحب تھا۔ رسول اللہ کے زمانہ میں جب یہ منسوخ ہو گیا تو اس نسخ سے صرف اس کا استحباب جاتا رہا اس کا مباح ہونا باقی ہے اور مباح چیز کی ممانعت کہاں آئی ہے[2]

اس احترام و عقیدت سے جو فوائد مرید اور دیگر وابستگان کو حاصل ہوتے ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت شبلی کے معتقدین ایک روز جب ان کے پاس سے اٹھ کر جانے لگے تو

---

[1] عوارف، ص ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۱ [2] فوائد الفواد ص ۳۱۵؛ سیر الاولیاء ص ۳۴۲۔ (تصوف، ص ۱۶۴-۱۶۵ ۱۶۷)

انھوں نے ان کی طرف رخ کرکے کہا:

جاؤ! میں تمہارے ساتھ ہوں تم جہاں کہیں بھی ہو، تم میری نگرانی اور پاسبانی میں ہو۔

شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں کہ:

میرے ساتھیوں، مریدوں اور چاہنے والوں میں سے جو بھی قیامت تک اپنی سواری پر سے لغزش کھائے گا میں اسے تھام لوں گا۔

حضرت نظام الدین اولیا، جب دہلی کے لیے عازم سفر ہوئے تو راستہ میں جہاں شیر یا چوروں کا خطرہ محسوس ہوتا ان کے ہم سفر کہتے:

اے پیر حاضر ہوئیے، ہم آپ کی حفاظت اور پناہ میں سفر کر رہے ہیں۔

شیخ ابوالحسن خرقانی کے متعلق روایت ہے کہ تاجروں کی ایک جماعت نے سفر تجارت میں اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے ان سے کوئی دعا پوچھی تو فرمایا کہ جب کوئی خطرناک موقع پیش آجائے تو فوراً میرا نام لے لینا۔ اثنا سفر میں ان کا سامنا رہزنوں سے ہوا تو جن لوگوں نے اس وقت شیخ کا نام لیا وہ محفوظ رہے اور جنھوں نے خدا کا نام لیا اور آیتیں اور دعائیں پڑھیں وہ ہلاک ہو گئے[1]

یہ تو ہوا دنیاوی مفاد، رہا آخرت کا معاملہ تو پیر کے بارے میں یہ تصور ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ شفاعت کریں گے، ضروری ہوا تو اس وقت تک خود بھی جنت میں نہیں جائیں گے جب تک مریدوں کی مغفرت نہ ہو جائے۔

خواجہ اویس قرنی کا قصہ تو آپ پڑھ ہی چکے کہ انھوں نے اس امت کے کتنے لوگوں کی مغفرت کرائی۔ شیخ نظام الدین اولیا، نے ہر کس و ناکس سے بیعت لینے کی ایک خاص وجہ یہ بتائی کہ ان کے شیخ حضرت فریدالدین گنج شکر نے انھیں اس کا اطمینان دلایا ہے کہ ان کے مریدوں کو اپنے ہمراہ لیے بغیر خود بھی جنت میں قدم نہ رکھیں گے۔

حضرت حاتم اصم کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے ایک بار حضرت سے فرمایا کہ میں نے اپنے شاگردوں سے کہہ دیا ہے کہ جو قیامت کے دن دوزخیوں کی شفاعت

---

[1] اس قسم کے دیگر واقعات کے لیے دیکھئے۔ تصوف، ص ۱۶۷-۱۷۱

کر کے انھیں جنت میں نہ لے جائے وہ میرا شاگرد نہیں۔ اس پر حضرت بایزید نے کہا کہ میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ میرا شاگرد نہیں جو قیامت کے دن کھڑا ہو کر ان تمام موحدین کو جنھیں دوزخ میں لے جانے کا حکم ہو ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں جنت میں نہ لے جائے[۱]

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیخ یا پیر ولی ہوتا ہے، اور ولی کے بارے میں صوفیا، کا وہی عقیدہ ہے جو شیعوں کا امام کے بارے میں ہے۔

صوفیا، کا کہنا ہے کہ ہر رسول، رسول ہونے کے ساتھ ولی بھی ہوتا ہے۔ بہ حیثیت رسول ظاہر دین کی اور بہ حیثیت ولی باطن دین کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کی ذات میں منصب رسالت اور منصب ولایت دونوں جمع ہوتے ہیں۔ شیخ ہجویری فرماتے ہیں:

تمام انبیا، اولیا، ہوتے ہیں، مگر کوئی ولی نہیں بن سکتا[۲]

اور شیخ اکبر کے نزدیک رسول، رسالت، نبوت، ولایت اور ایمان چاروں کا جامع ہوتا ہے[۳] رسول کی ولایت کے وارث اور امین اولیا، ہوتے ہیں جو خاص طور پر باطنِ دین کی تعلیم دیتے ہیں[۴]

یہی بات شیعہ بھی کہتے ہیں کہ ہر رسول رسول ہونے کے ساتھ امام بھی ہوتا ہے اور اس کی امامت کے وارث ائمہ میں جو علم باطن کے امین ہوتے ہیں[۵]

ان ائمہ کی مشہور صفات، یہ بیان کی گئی ہیں:

وہ زمین پر لوگوں کے لیے اللہ کی حجت (ثبوت) اور آیت ہوتے ہیں۔ پانچویں امام محمد الباقر سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اہل فلک کی سلامتی ستاروں کے دم سے اور اہل زمین کی آپ کے اہلِ بیت یعنی ائمہ کے دم

---

[۱] تصوف، ۱۷۲-۱۷۳ [۲] کشف المحجوب ص۲۹۳

[۳] ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ رسول بہ حیثیت ولی افضل و برتر ہوتا ہے باعتبار اپنے نبی یا رسول ہونے کے۔ الفتوحات المکیہ، دوم، ص۵ ؛ فصوص الحکم، ص ۲۸۱ (تصوف، ۱۷۹، ۱۸۰)

[۴] شاہ ولی اللہ صاحب کا اس سلسلے میں بیان آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔

[۵] بعض شیعہ روایات میں حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام ائمہ کے ناموں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ دیکھئے، شیعی اسلام، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۷-۱۵۷!

سے ہے۔ اگر ستارے نہ رہیں تو اہل فلک پر اور ائمہ نہ رہیں تو اہل زمین پر آفت نازل ہو جائے۔ ان کی اطاعت میں اللہ کی اطاعت ہے۔ یہ معصوم اور پاک ہیں۔ نہ غلطی کرتے ہیں نہ بغاوت یہی ہیں جو مدد کرتے ہیں، ان ہی کی بدولت فتوحات حاصل ہوتی ہیں یہی راہ ہدایت دکھاتے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے مخلوق کو رزق ملتا ہے، زمینیں سرسبز ہوتی ہیں، بارش ہوتی ہے، برکتیں حاصل ہوتی ہیں اور گنہ گاروں اور سرکشوں کو فوراً سزا نہیں ملتی، مہلت دے دی جاتی ہے[1] اب دیکھئے کیا اولیاء کے اوصاف ائمہ سے کچھ مختلف ہیں شیخ ہجویری فرماتے ہیں:

> خداوند تعالیٰ کے اولیاء ہیں جنھیں دوستی اور ولایت سے خاص گردانا گیا ہے۔ اور وہ اس کے ملک کے والی ہیں جن کو اللہ عزوجل نے برگزیدہ کیا ہے اور اپنے فعل اور اظہار کا نشانہ گردانا ہے اور طرح طرح کی کرامتوں سے خاص کیے گئے ہیں اور طبعی آفتوں سے ان کو پاک گردانا گیا ہے اور نیز نفس اور ہوا کی پیروی سے ان کو خلاصی دی ہوئی ہے ..... ہم سے پہلے گذشتہ زمانے میں بھی ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں اور ہم سے پیچھے بھی قیامت کے دن تک ہوتے رہیں گے .....
>
> پس خداوند تعالیٰ نے برہان نبوی کو آج کے دن تک باقی رکھا ہے اور اولیاء کو اس کے اظہار کا سبب گردانا ہے تاکہ ہمیشہ خدا کی آیتیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیلیں ظاہر ہوں اور بالخصوص ان کو جہان کا والی بنایا ہے ..... آسمانوں سے ان کے قدموں کی برکتوں سے باران رحمت نازل ہو.....

اور ان ہی کی برکت سے زمین سرسبز ہوتی ہے اور کافروں پر فتح حاصل ہوتی ہے[2] شیخ سہروردی مشائخ کی برکتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر میں زمین کے باشندوں کو سزا دینا چاہوں یا ان پر کوئی عذاب نازل کروں تو انھیں یاد کرکے دنیا والوں سے عذاب کو لوٹا

---

[1] شیعی اسلام، ص ۱۴۸ [2] کشف المحجوب، ص ۲۶۴-۲۶۵

دیتا ہوں[1]

تصور ولایت پر تفصیلی بحث ابو عبداللہ محمد بن علی الحکیم الترمذی (م ۸۹۸ھ) نے اپنی کتاب ختم الولایہ میں کی ہے اسی سے شیخ ہجویری اور دوسرے صوفیہ نے استفادہ کیا ہے مختصر یہ کہ بقول شیخ ہجویری اولیاء کی تعداد چار ہزار کے قریب ہے جو :

> چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے اور نہ ہی اپنے حال کی خوبی کو جانتے ہیں اور تمام احوال میں اپنے آپ سے اور نیز مخلوقات سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ لیکن وہ جو حل اور عقد کے مالک اور خدا کی بارگاہ کے سپاہی ہیں تین سو ہیں جنھیں اخیار بھی کہتے ہیں اور چالیس دوسرے ہیں جنھیں ابدال کہتے ہیں اور سات اور ہیں جنھیں ابرار کہتے ہیں اور چار اور ہیں جنھیں اوتاد کہتے ہیں اور تین دوسرے ہیں جنھیں نقباء کہتے ہیں اور ایک اور ہے جسے قطب اور غوث بھی کہتے ہیں اور یہ سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور کاموں میں ایک دوسرے کے محتاج بھی ہیں[2]

اس تصور کو صوفیاء نے عملی شکل اس طرح دی کہ دنیا کو بہت سے علاقوں (ولایتوں) میں تقسیم کر دیا اور ہر علاقہ ایک ولی کی نگرانی میں دے دیا گیا، اور وہی اس علاقے کے تمام انتظامی امور کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ اس نظام کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نظامی رقم طراز ہیں :

> منظم اور موثر طریقے پر کام کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہر شخص کا دائرہ عمل واضح اور متعین ہو۔ اس ضمن میں تصور "ولایت" مددگار ثابت ہوا اور مخصوص علاقائی ذمہ داری کے ساتھ مشائخ کے منظم گروہ اسلامی دنیا کے چپے چپے پر پھیل کر اصلاح و تربیت کے کام میں مصروف ہو گئے ... "ولایت" اور "قطب و ابدال" کے تصور کا اصل مقصد چھوٹے بڑے علاقوں میں ایک روحانی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ منظم طریقہ پر کام کرنا تھا[3]

۱۔ عوارف، ص ۲۳۰ ۔ ۲۔ کشف المحجوب ص ۲۶۵ ۔ ۳۔ مشائخ چشت، ص ۱۶۰
۱۴۹

پروفیسر صاحب کی توجیہ اپنی جگہ لیکن مشائخ نے جو تاثر دیا ہے وہ یہ ہے کہ مخصوص علاقے کے لوگ وہاں کے شیخ (یا ولی) کی پناہ میں ہوتے تھے۔ خود پروفیسر موصوف ہی نے سیر الاولیاء سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ جب خواجہ معین الدین اپنے مرید خاص شیخ قطب الدین بختیار کاکی کو دہلی سے اپنے ہمراہ اجمیر لے جانے لگے تو "تمام اہلِ شہر" ان کے پیچھے نکل آئے۔ یہ دیکھ کر خواجہ صاحب نے شیخ بختیار سے فرمایا:

> برو ایں شہر را در پناہ تو گذاشتیم: جاؤ میں نے اس شہر کو تمہاری پناہ میں چھوڑا۔[1] پھر ایک اور جگہ (ص ۲۷۷) شیخ نظام الدین کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے بابا فرید اور دوسرے چند مشائخ کے بارے میں فرمایا کہ بہت سے لوگ ان کے پاس آتے اور اپنے تئیں ان عاشقان خدا کی پناہ میں ڈال دیتے تھے۔

مزید فرمایا:

> اگر خدا تعالیٰ کا ایک محبوب اور پسندیدہ شخص ایک جہان کے گناہگاروں کو اپنے سایۂ حمایت میں لینا چاہے، تو لے سکتا ہے۔

اس قسم کی باتوں کا مریدوں اور عوام پر یہ اثر ہوا کہ یہ خود کو ان بزرگوں کی پناہ میں سمجھنے لگے اور ہر مصیبت کے وقت "یا پیر" اور "یا غوث" پکارنے لگے، اور ان میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ ان کی تمام دینی اور دنیاوی ضروریات "پیر صاحب" ہی پوری کر سکتے ہیں۔ یہ معاملہ ان بزرگوں کی حیات ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی قائم رہا ہے اور جس نے قبر پرستی کی شکل اختیار کر لی ہے جہاں ہزارہا مرید اور عقیدت مند مختلف نذرانے پیش کرنے کے بعد جو کچھ کرتے ہیں وہ سب کو معلوم ہی ہے ۔۔ دست بستہ قیام، رکوع و سجود، قعدہ و طواف اور پھر کس کس طرح اور کیا کیا دعائیں صاحب مزار سے مانگی نہیں جاتیں۔ جب ان تمام چیزوں کی تعلیم خود صوفیاء کرام نے دی ہے تو انھیں "گمراہیاں" سمجھنے اور تصوف سے خارج کرنے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟

تصوف کی حقیقت

یہ ہے وہ تصوف جس کی ہزاروں تعریفیں کی گئی ہیں۔ کوئی اسے اسلام کی روح

---

[1] مشائخ چشت ص ۲۰۸

بتاتا ہے تو کوئی علم احسان، کوئی محبت الٰہی سے تعبیر کرتا ہے تو کوئی خدمت خلق سے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصوف دیگر مذاہب کی طرح کوئی مستقل مذہب نہیں ہے۔ جس کے بنیادی اصول ایک خاص شخص نے متعین کیے ہوں، نہ اس کی کوئی مستند کتاب ہے جو معیار بن سکے۔ یہ دراصل مجموعہ ہے مختلف عقائد و نظریات کا[1]۔ اس کا سارا نظام شیعیت کی بنیاد پر قائم ہے، اس کی ساری عمارت شیعی نقشے کے مطابق تعمیر ہوئی ہے لیکن اس میں "سُنی" عقائد و نظریات بھی شامل ہیں، عیسائیت کے اصول بھی ہیں، بدھ مذہب اور ہندو مذہب، یونانی فلسفے کے اثرات بھی ہیں۔ ان سب عناصر کے مجموعے ہی کا نام تصوف ہے۔

جس طرح اردو زبان ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے وجود میں آئی، اس میں عربی الفاظ و تراکیب بھی ہیں، فارسی الفاظ بھی ہیں، ہندوستانی زبانوں اور متعدد بیرونی زبانوں کے الفاظ و محاورے بھی، اسی طرح تصوف کا بھی نشو و نما ہوا ہے۔

اردو زبان میں بھی عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت ہے تو اردو زبان کو یوں تقسیم نہیں کر سکتے کہ یہ "عربی اردو" ہے اور یہ "فارسی اردو" ہے۔ ٹھیک اسی طرح اسلامی یا غیر اسلامی عناصر کی بنا پر تصوف کی تقسیم اس طرح نہیں کر سکتے کہ یہ اسلامی تصوف ہے اور یہ غیر اسلامی یا مسخ شدہ تصوف ہے، کیونکہ تصوف تو نام ہی اسلامی اور غیر اسلامی عقاید کے مجموعے کا ہے۔

اگر آپ نے یہ کوشش کی کہ اردو زبان سے تمام بیرونی زبانوں کے الفاظ خارج کر دیں تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ اگر آپ نے اس میں سے عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی زبان کے تمام الفاظ نکال دیئے تو پھر اردو کا وجود ہی کہاں باقی رہے گا!

ٹھیک اسی طرح اگر آپ نے تصوف سے شیعی اور تمام غیر اسلامی عناصر نکال دیے تو پھر تصوف کا وجود ہی ختم ہو جائے گا اور صرف اسلام کے چند اصول باقی رہ جائیں گے۔ اس لیے اگر آپ تصوف کو قبول کرتے ہیں تو ان تمام غیر اسلامی عقائد و نظریات کو بھی قبول کرنا ہوگا، جو اس کے وجود سے لپٹے ہوئے ہیں اور جو کسی طرح بھی اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔

(ختم شد)

---

[1] بلکہ متضاد باتوں کا اور اس تضاد کی وجہ حضرت شبلی نے یہ بتائی ہے: "ہم کبھی عالم بے خودی میں ہوتے ہیں اور کبھی خودی میں۔" (تذکرۃ اولیا، ۳۱۸) اور جو کچھ یہ "عالم بے خودی" میں کہتے ہیں اسی سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

بحث و نظر

عہدِ عثمانؓ میں جمع قرآن

چند اعتراضات کا جائزہ

ڈاکٹر حافظ محمود اختر

حضرت عثمانؓ نے جمعِ قرآن کا جو کارنامہ سرانجام دیا اس کی بنا پر امت نے آپ کو "جامع القرآن" کا دائمی خطاب دیا۔ اس سے امتِ مسلمہ کو ایسا مصحف ملا جس میں تمام کی تمام سات حروف (سبعہ احرف) ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ لیکن بعض حلقوں نے قرآن مجید کے متن کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے آپؓ کے اس کارنامے کو غلط رنگ دیا، کئی ایک روایات، جن میں "جمعِ عثمان" کا ذکر ملتا ہے، کو غلط طور پر پیش کیا اور مفروضات کی ایک عمارت تعمیر کر ڈالی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم حضرت عثمانؓ کے اس کارنامہ کے حوالے سے مندرجہ ذیل اشکالات پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ حضرت عثمانؓ نے یہ کام بلا جواز کیا۔ اس کے پس منظر میں ان کے سیاسی عزائم کارفرما تھے۔

۲۔ مستشرق بلاشر (BLACHERE) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ذاتی غرض سے اپنی اور دیگر مہاجرین کی اہمیت جتانے کے لیے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔[۱]

۳۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے مصحف کے علاوہ قرآن مجید کے باقی نسخے جلا دیے، گویا قرآن کا بہت سا حصہ ضائع کر دیا گیا۔[۲]

۴۔ حضرت عثمانؓ نے جن لوگوں کو تدوین کمیٹی کا رکن بنایا ان میں سے کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو حضورؐ کے بتائے ہوئے ماہرینِ قرآن میں سے ہو۔[۳]

۵۔ تدوین کمیٹی کے ارکان کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض روایات میں ان ارکان کی تعداد بارہ اور بعض میں چار ہے۔ گویا یہ معاملہ ابہام کا شکار ہے۔[۴]

۶۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو حضرت عثمانؓ کی اس کارروائی سے اختلاف تھا۔ انھوں نے لوگوں کو اپنے مصاحف حکومت کے سپرد کرنے سے منع فرمایا۔[۵]

۷۔ حضرت عثمانؓ نے اگرچہ مسلمانوں کے اختلافات مٹانے کے لیے یہ کارروائی کی، لیکن یہ اختلافات ختم نہ ہوسکے۔ کیونکہ آپؓ کے بعد بھی لوگوں کے پاس ذاتی مصاحف موجود رہے۔[۶]

۸۔ جب حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید کا ایک باضابطہ نسخہ تیار کروایا، اس وقت تک مسلمانوں میں قرآن مجید کے بارے میں بہت سے اختلافات پیدا ہوچکے تھے اور ان اختلافات کو ختم کرنا ممکن نہ تھا۔[۷]

۹۔ حضرت عثمانؓ کی قائم کردہ کمیٹی نے جب اپنا تیار کردہ نسخہ آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اس میں اغلاط موجود ہیں اور اہلِ عرب اپنی زبان سے ان کی اصلاح کریں گے۔

یہاں ان روایات واشکالات کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

کیا حضرت عثمانؓ کی یہ کارروائی بلاجواز تھی؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں جب قرآن مجید جمع ہوچکا تھا تو پھر آپ کو دوبارہ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

حقائق اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی یہ کارروائی بلاجواز تھی۔ تمام معتبر کتبِ حدیث میں وہ روایت موجود ہے جو حضرت عثمان کی اس کارروائی کا سبب بنی۔ اس روایت کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

عن ابن شهاب أن	ابن شہاب روایت کرتے ہیں: انس
انس بن مالك حدثه أن	بن مالکؓ نے بیان فرمایا کہ حضرت حذیفہ
حذيفة بن اليمان قدم	بن الیمان آذربائیجان کی لڑائی کے بعد
على عثمان وكان يغازى	حضرت عثمانؓ کے پاس آئے۔ انھیں
اهل الشام في فتح ارمينية	قرآن مجید کی تلاوت میں لوگوں کے
و آذربيجان مع اهل	اختلاف نے بہت پریشان کردیا تھا۔
العراق فافزع حذيفة	انھوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا: اے
اختلافهم في القراءة،	امیرالمومنین! اس امت کی خبر لیجیے اس

فقال حذیفة لعثمان، یا امیر المومنین ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیہود والنصاری[۱۰]	سے قبل کہ وہ اپنی کتاب میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف کرنے لگیں۔

یہ ایک طویل روایت ہے۔ اس جگہ اس کا صرف وہی حصّہ نقل کیا گیا ہے جتنا مطلوب تھا۔ آئندہ چل کر باقی روایت بھی زیرِ بحث آئے گی۔ یہ روایت واضح کر رہی ہے کہ اختلاف موجود تھا اور اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کا انسداد کیا جائے۔ اس اختلاف کے بارے میں ایک اور روایت ابن اشتہ نے ایوب کے طریق پر ابو قلابہؓ سے بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ بنو عامر کے ایک شخص انس بن مالک نے بیان کیا کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن میں اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ پڑھنے والے بچوں اور معلموں کے درمیان تلواریں نکل آئیں۔ حضرت عثمان کو اس کی خبر ملی تو فرمایا کہ لوگ میرے سامنے ہی قرآن کو جھٹلانے اور اس میں غلطی کرنے لگے ہیں تو جو لوگ مجھ سے دور ہوں گے وہ ان لوگوں کی نسبت زیادہ جھٹلانے والے اور غلطی کرنے والے ہوں گے۔ اے اصحاب محمدؐ تم جمع ہو جاؤ اور لوگوں کے لیے ایک امام (قرآن کا ایک راہنما نسخہ) لکھو۔[۱۱]

ایک اور روایت ہے کہ ایک قاری کے شاگرد دوسرے قاری کے شاگرد سے جھگڑتے۔ وہ کہتے کہ تم غلط پڑھتے ہو اور دوسرے پہلے کو غلط قرار دیتے اور ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے۔[۱۲]

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے یہ کام بلا جواز نہیں کیا بلکہ اس کی ضرورت موجود تھی۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس "اختلاف" سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس ابتدائی دور میں ہی قرآنِ مجید کا متن اختلافات کا شکار ہو چکا تھا اور ہر کوئی اپنے اپنے انداز سے پڑھنے لگا تھا۔ اس اختلاف کی نوعیت مولانا تقی عثمانی کے الفاظ میں یوں ہے:

حضرت عثمانؓ کے دور تک اسلام عرب و عجم میں پھیل چکا تھا۔ صحابہ کرام تبلیغِ دین کے سلسلے میں بلاد و امصار میں پھیل چکے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم صلعم سے مختلف قراءتوں میں قرآنِ مجید پڑھا تھا۔ ان حضرات نے اسی انداز سے قرآنِ مجید اپنے شاگردوں

کو پڑھایا دور دراز کے لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہ تھے کہ قرآن مجید کے بعض الفاظ ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھنے کی اجازت تھی۔ اسی بنا پر لوگوں میں جھگڑے کھڑے ہونے لگے۔ ایک شخص اپنی قراءت کو درست اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتا۔ ان حالات میں اس بات کا خدشہ تھا کہ لوگ قرآن مجید کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ دوسرے، حضرت زید بن ثابتؓ کے لکھے ہوئے نسخہ کے سوا پورے عالم اسلام میں کوئی نسخہ نہ تھا جو پوری امت کے لیے حجت بن سکے۔ اس نسخہ کے علاوہ باقی نسخے صحابہ کرامؓ کے ذاتی نسخے تھے۔ ان میں سات حروف کو یکجا کرنے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی قراءت کے مطابق اپنا اپنا نسخہ تحریر کر رکھا تھا۔ اس طرح کے جھگڑوں کے تصفیہ کے لیے کوئی قابل اعتماد صورت یہی ہو سکتی تھی کہ ایسے نسخے عالم اسلام میں پھیلا دئے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون سی قراءت صحیح اور کون سی غلط ہے۔ حضرت عثمانؓ نے یہی کارنامہ سرانجام دیا۔"[۱۳]

گویا یہ اختلاف قرآن مجید کے متن یا اس میں کمی بیشی کا نہیں تھا بلکہ قرآن مجید کے بعض الفاظ کی ادائیگی کا تھا اور اگر بنظر حقیقت دیکھا جائے تو یہ اختلاف دراصل اختلاف تھا ہی نہیں۔ قرآن کے بعض الفاظ ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھنے کی اجازت تو خود اللہ تعالیٰ نے عطا کی تھی۔[۱۴]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن مجید کے جمع و تدوین کا کام حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں انجام پا چکا تھا تو حضرت عثمانؓ کے کام کی نوعیت کیا تھی؟ علامہ جلال الدین سیوطی نے ابن التین اور دیگر علماء کا نقطۂ نگاہ نقل کیا ہے کہ:

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے قرآن مجید جمع کرنے کا فرق یہ ہے کہ خلیفۂ اول نے یہ کام اس خوف سے کیا تھا کہ کہیں حاملین قرآن کی موت کے ساتھ قرآن کا بھی کوئی حصّہ ضائع نہ ہو جائے کیونکہ قرآن اس وقت ایک جگہ اکٹھا نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کو صحیفوں میں اس ترتیب سے جمع کیا کہ ہر ایک سورت کی آیات حضور اکرم صلعم کے حکم کے مطابق درج کر دیں اور حضرت عثمانؓ کے جمع کرنے کی یہ شکل تھی کہ جس وقت قرآن کی تلاوت کے انداز اور طریقہ میں اختلاف زیادہ ہو گیا

اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ قرآن اپنی اپنی زبان میں پڑھنے لگے، اور ظاہر ہے کہ عرب کی زبانیں بہت وسیع ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں سے ہر ایک لہجے کے لوگ دوسرے لہجے والوں کو برسر عام غلط کہنے لگے اور بات بڑھ جانے اور مشکلات پیدا ہونے کا خدشہ پیدا ہوگیا۔ اس لیے حضرت عثمانؓ نے قرآن کو ایک ہی مصحف میں سورتوں کی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا اور تمام عرب کی زبانوں کو چھوڑ کر محض قبیلہ قریش کی زبان پر اکتفا کر لیا۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن، زبانِ قریش میں نازل ہوا ہے۔ صرف ابتداء میں دقت سے بچنے کے لیے اس کی تلاوت قریش کے علاوہ دوسری زبانوں کے تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی رائے یہ تھی کہ جس ضرورت کے تحت یہ اجازت دی گئی تھی وہ ضرورت اب ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا انھوں نے قرآن کی قرأت محض ایک ہی زبان میں منحصر کر دی[۱۵]

اس سلسلے میں علامہ سیوطیؒ نے قاضی ابوبکر کا ایک بیان نقل کیا ہے۔

حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرح قرآن کو محض بین اللوحین ہی جمع کر دینے کا ارادہ نہیں فرمایا بلکہ انھوں نے تمام مسلمانوں کو ان معروف اور ثابت قرأتوں پر جمع کر دینے کا ارادہ کیا جو نبی اکرم صلعم سے منقول چلی آرہی تھیں اور جس قدر قرأتیں اس کے علاوہ پیدا ہوگئی تھیں انھیں مٹا دینا چاہا[۱۶]

علامہ سیوطی نے حارث محاسبی کا نقطۂ نگاہ نقل کیا ہے کہ:

حضرت عثمانؓ نے تو یہ کیا کہ اپنے اور اپنے پاس موجود مہاجرین و انصار کے اتفاق رائے سے لوگوں کو ایک ہی قرأت پر آمادہ کر لیا[۱۷]

حضرت عثمانؓ نے درحقیقت ایک ایسا رسم الخط اختیار فرمایا جس میں ثابت شدہ تمام قرائتیں سما سکتی تھیں۔ گویا انھوں نے قرآن کے الفاظ و حروف کی تعداد، آیات و سور کی ترتیب و تعداد میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں کی جس سے قرآن کے متن میں کوئی کمی بیشی ہوئی ہو۔ ان کے رسم الخط میں نہ نقطے لگائے گئے نہ حرکات، مثلاً سورۃ البقرہ میں ننسرہا لکھا تاکہ اسے نُنْشِزُہا اور نَنْشُرُہا، دونوں طرح پڑھا جا سکے۔ کیونکہ یہ دونوں قرائتیں درست ہیں۔ اسی طرح سورۃ الحجرات میں فَتَبَیَّنُوا کو فَتَبَیَّنُوا بھی پڑھا گیا اور فَتَثَبَّتُوا بھی۔ حضرت عثمانؓ نے اسے "فتبینو" لکھا تاکہ دونوں طرح پڑھا جا سکے۔[۱۸]

اس طرح حضرت عثمانؓ کا مقصد "سات حروف" کو ختم کرنا نہ تھا بلکہ انھوں نے تو انھیں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا۔ یہ نقطۂ نگاہ علامہ ابن حزم نے الفصل فی الملل میں[۱۹] مولانا عبدالحق حقانی نے مقدمہ تفسیر حقانی میں[۲۰] علامہ زرقانی نے مناہل العرفان[۲۱] میں بیان کیا ہے آپ نے درحقیقت ایسا رسم الخط اختیار فرمایا کہ اس کی موجودگی میں تمام قراءتوں والے اپنے اپنے انداز کے مطابق پڑھ سکیں۔

علامہ جزری لکھتے ہیں:

فقہاء، قرآء اور متکلمین کی جماعتوں کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ عثمانی مصاحف ساتوں حروف پر مشتمل ہیں"۔[۲۲]

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

واما قول من قال ابطل	رہا یہ قول کہ حضرت عثمانؓ نے "چھ حروف"
الاحرف الستة فقد کذب	کو منسوخ کردیا تو جس نے یہ بات کہی
من قال ذالك ولو فعل عثمان	ہے اس نے بالکل غلط کہا ہے۔ اگر
ذالك او اراده لخرج عن الاسلام	آپؓ ایسا کرتے یا ایسا کرنے کا ارادہ کرتے
ولما مطل ساعة بل الاحرف	تو ایک ساعت کے توقف کے بغیر اسلام
السبعة کلها موجودة عندنا	سے خارج ہوجاتے بلکہ واقعہ یہ ہے
قائمة کما کانت مثبوتة فی	کہ ساتوں کے سات حروف ہمارے
القرأات المشهورة المأثورة"[۲۳]	پاس بعینہ موجود و مشہور اور قراءتوں
	میں محفوظ ہیں۔

علامہ بدرالدین عینی، امام ابوالحسن علی اشعری کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

واقعہ یہ ہے کہ ساتوں حروف ہماری موجودہ قرات میں موجود ہیں[۲۴] علامہ زرکشی نے قاضی ابوبکر کا قول نقل کیا ہے کہ:

الصحیح ان هذه الاحرف	صحیح بات یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف
السبعة ظهرت واستفاضت	حضور اکرم صلعم سے شہرت کے ساتھ
عن رسول الله صلعم وضبطها	منقول ہیں ائمہ نے انھیں محفوظ رکھا ہے
عنه الائمة واثبتها عثمان	اور حضرت عثمانؓ اور صحابہ کرام نے انھیں

والصحابة فی المصحف[۲۵] مصحف میں باقی رکھا۔

ان حضراتِ گرامی کے علاوہ علامہ علی القاری[۲۶]، علامہ زرقانی[۲۷]، شاہ ولی اللہ[۲۸]، علامہ انور شاہ کشمیری[۲۹]، علامہ زاہد الکوثری[۳۰] نے اسی نقطہ نگاہ کا اظہار کیا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ ابن جریر کے اس خیال کو کہ مصحفِ عثمانؓ میں "سات حروف" ختم کر دئے گئے، درست تسلیم نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں کہ دراصل علامہ ابن جریر طبری پر "سبعہ احرف" کے صحیح معانی واضح نہیں ہو سکے[۳۱]۔

اس سلسلے میں علامہ زاہد الکوثری لکھتے ہیں:

"بہت سے لوگوں نے ابن جریر طبری کے مقام سے متاثر ہو کر یہ رائے قائم کر لی ہے کہ اس وقت قرآنِ مجید صرف ایک ہی حرف پر موجود ہے ...... ابن جریر کی رائے نہایت سنگین اور خطرناک ہے[۳۲]"

جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآنِ مجید جلا ڈالا، اس بارے میں بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ لیکن اسے ایک امرِ واقع بھی مان لیا جائے تو یہ کارروائی نہایت ناگزیر تھی۔ کیونکہ قرات کے اختلاف کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے اور ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے تھے اگر سرکاری اور متفقہ نسخے کے علاوہ باقی نسخے باقی رکھے جاتے تو حضرت عثمان کی ساری محنت ضائع ہو جاتی اور لوگ اسی طرح اختلافات کا شکار رہتے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس نسخے کو متفقہ نسخے کے طور پر متعارف کروایا جاتا جو باقی نسخوں کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ پھر یہ کہ اس کارروائی سے قرآنِ مجید کے ایک شوشے پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا اس لیے کہ قرآنِ مجید لوگوں کے سینوں میں موجود تھا۔ اس صورت میں کسی چیز کے ضائع ہونے کا امکان نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر آپ کا مقصد یہی ہوتا کہ آپ کے نسخہ کو چیلنج سے بچایا جائے تو آپ کبھی بھی حضرت حفصہؓ کا نسخہ انھیں واپس نہ کرتے اور یہ سرکاری تحویل میں آجاتا۔ حضرت حفصہؓ کی کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی۔ اس بات کا جواز موجود تھا کہ آپ امت کے اجتماعی مفاد کا حوالہ دے کر اس نسخہ کو اپنے ہی پاس رکھ لیتے۔ یہ نسخہ ۲۴ ہجری سے لے کر ۶۴ یا ۶۵ ہجری تک موجود رہا۔

اس نسخے کی موجودگی میں حضرت حفصہؓ اور دیگر حفاظِ کرام کسی بھی طرح کا تصرّف برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اس پورے عرصے میں ہمیں کہیں سے بھی ایک آواز بلند ہوتی ہوئی سنائی نہیں دیتی کہ حضرت عثمانؓ نے قرآنِ مجید کے نسخے جلادئے۔

یہ بات عملاً بھی ناممکن تھی کہ حضرت عثمانؓ کی پولیس آناً فاناً پوری مملکت میں حرکت میں آگئی ہو اور اس نے تمام لوگوں سے جبراً قرآن مجید برآمد کرواکے جلادئے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ ایسا ہوا اور نہ ایسا ممکن تھا۔

باقی مصاحف کے جلادئے جانے کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے علامہ زرکشی لکھتے ہیں:۔

واما تعلق الروافض بأنّ عثمان احرق المصاحف فانه جهل منهم وعمى فانّ هٰذا من فضائله وعلمه؛ فانه اصلح ولمّ الشعث، وكان ذلك واجبًا عليه، ولو تركه لعصى، لما فيه من التضييع؛ وحاشاه من ذالك۔	جہاں تک روافض کی اس بات کا تعلق ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف کو جلادیا تھا تو یہ ان کی جہالت اور اندھاپن (حقائق سے آنکھیں بند کرلینا) ہے یہ تو ان کے فضائل اور علم میں شمار ہوتا ہے۔ بے شک انھوں نے یہ اچھا کارنامہ انجام دیا کہ بگاڑ کی اصلاح کردی اور یہ کام (بحیثیت خلیفہ) ان پر لازم تھا۔ اگر وہ یہ کام نہ کرتے تو یہ غلط کام ہوتا۔ کیونکہ (اس صورتِ حال میں) قرآنِ مجید کے ضائع ہوجانے کا خدشہ تھا اور وہ اس سے بچنا چاہتے تھے۔
واما قولهم: انه احرق المصاحف؛ فانه غير ثابت، ولو ثبت لوجب حمله على انه احرق مصاحف قد اودعت مالا يحل قراءته وفى الجملة انه امام عدل غير معاند ولا طاغ	اور ان کا یہ قول کہ حضرت عثمانؓ نے قرآنی مصاحف جلاڈالے تھے ثابت نہیں ہے اور اگر یہ ثابت ہو بھی جائے تب بھی ہم اس فعل کو اسی پر محمول کریں گے کہ انھوں نے ان ہی مصاحف

في التنزيل، ولم يحرق الا ما يجب احراقه ولهذا لم ينكر عليه ذلك، بل رضوه وعدّوه من مناقبه، حتى قال عليّ: لو وليت ما ولي عثمان لعملت بالمصاحف ما عمل.

کو جلایا جن میں ایسی قرأتیں موجود تھیں جن کا پڑھنا جائز نہ تھا۔ مختصر یہ کہ حضرت عثمانؓ امام عادل تھے، حق با قرآن کے مخالف نہ تھے اور تنزیل کے بھی مخالف نہ تھے۔ انھوں نے اسی چیز کو جلایا جس کا جلانا ان پر واجب تھا۔ اسی لیے کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کے ساتھ اس سلسلے میں سب متفق ہوئے اور جمع قرآن کو سب نے ان کے مناقب میں شمار کیا۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ نے فرمایا اگر مجھے عثمان کی طرح والی بنایا جاتا تو مصاحف میں وہی کچھ کرتا جو عثمانؓ نے کیا۔

جہاں تک جمع قرآن کمیٹی کے ارکان کی تعداد میں فرق والی روایات کا تعلق ہے، ان میں ابن ابی داؤد کی بیان کردہ ایک روایت میں ارکان کی تعداد بارہ[٣٣] اور بخاری کی روایت کے مطابق چار ہے[٣٤]۔

بعض مستشرقین نے بھی اس اختلاف کو اچھالا ہے اور حضرت عثمانؓ کی جمع قرآن کی کارروائی کو انھوں نے متن قرآن کو مشکوک بنانے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے[٣٥]۔

جب ہم ابن ابی داؤد کی بیان کردہ روایات کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اس موضوع سے متعلق تمام روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ ان روایات میں کون سی روایت غلط ہے، کون سی ضعیف اور کون سی معتبر۔ چنانچہ وہ ایک طرف اگر بارہ رکنی کمیٹی کا ذکر کرتے ہیں تو ساتھ ہی دو رکنی کمیٹی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صبحی صالح لکھتے ہیں۔ عجب بات ہے کہ ابن ابی داؤد ایک ہی مسئلہ کے بارے

میں مختلف روایات نقل کرنے کا بڑا شوق رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان میں واضح طور پر تضاد ہی کیوں نہ پایا جاتا ہو"[۳۶]

اس کے علاوہ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ بخاری شریف، قرآن مجید کے بعد معتبر ترین کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ وہ کتب احادیث کے طبقات میں طبقہ اوّل میں سرفہرست ہے۔ جبکہ ابن ابی داؤد کی "کتاب المصاحف" تیسرے یا چوتھے درجہ کی کتاب ہے۔ ابن ابی داؤد بطور محدث اور ان کی کتاب دونوں وہ مقام نہیں رکھتے جو بخاری اور ان کی الجامع الصحیح کو حاصل ہے۔ اس لیے عقلی اور اصولی طور پر بخاری کی روایت زیادہ معتبر ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ان متناقض روایات کا جائزہ لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ کام چار اصحابؓ کے ہی سپرد تھا لیکن دیگر صحابہ کرامؓ کو ان کی مدد پر مامور کیا گیا تھا۔ ان اصحابؓ میں حضرات ابیؓ ابن کعبؓ، کثیر بن افلح، مالک بن ابی عامر، انس بن مالک اور ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ تھے[۳۷]

حضرت عثمانؓ نے اس کام کے شروع کرنے سے پہلے اکابر صحابہؓ کو جمع فرمایا اور ان سے مشورہ کیا:

"مجھے یہ خبر ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے کو اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے لہٰذا اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ صحابہ کرامؓ نے ان سے پوچھا، آپ نے کیا سوچا ہے؟ آپ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کردیں تاکہ کوئی اختلاف و انتشار پیش نہ آئے۔ صحابہ کرامؓ نے اس رائے کو پسند کیا اور حضرت عثمانؓ کی تائید کی"[۳۸]

حضرت عثمانؓ والے نسخہ پر تمام صحابہ کرام کا اجماع ہوا تھا۔ علامہ مقری اپنی کتاب نفح الطیب میں لکھتے ہیں:

ھذا اجمع علیہ	یہ وہ مصحف ہے جس پر اصحاب
جماعۃ من اصحاب	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جماعت
رسول اللہ صلعم منہم	نے اجماع فرمایا تھا۔ ان صحابہ کرامؓ

زید بن ثابت وعبد اللہ بن زبیر وسعید بن العاص[۳۹]

میں زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر اور سعید بن العاص ہیں۔[۳۹]

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ایک مصحف تیار کیا گیا۔ اس میں شاذ قراءتوں کو چھوڑ دیا گیا صرف متواتر قراءتوں کو لیا گیا اور قبائلِ عرب کی سات زبانوں میں سے جن پر قرآن نازل کیا گیا تھا۔ ایک لغت قریش کو (رسم الخط میں) اختیار کر لیا گیا اور باقی لغات کے مصاحف ترک کر دئیے گئے[۴۰]

ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف میں یہ روایت موجود ہے کہ

حضرت علیؓ نے فرمایا حضرت عثمانؓ کے بارے میں بھلائی کے علاوہ کوئی بات نہ کہو کیونکہ مصاحف کے بارے میں انھوں نے جو کیا وہ ہماری موجودگی میں کیا۔ انھوں نے ہم سب سے مشورہ کیا کہ ان قراءتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیونکہ مجھے اطلاعات مل رہی ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے۔ حالانکہ یہ ایسی بات ہے جو کفر کے قریب تک پہنچتی ہے۔ اس پر ہم نے ان سے کہا کہ پھر آپ کی رائے کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ہم سب لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں تاکہ کوئی افتراق واختلاف باقی نہ رہے۔ ہم سب نے کہا آپ نے بڑی اچھی رائے قائم کی[۴۱]

سطور سابقہ میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں ان سے یہ باتیں واضح ہو رہی ہیں کہ

(۱) حضرت عثمانؓ کے عہد میں جو کارروائی ہوئی وہ بلا جواز نہ تھی۔ اس کی ضرورت دینی اعتبار سے بھی تھی اور عقل اور منطق بھی اس کی متقاضی تھی۔

یہ کام آپ نے صرف اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ صحابہؓ کا مشورہ بھی اس میں شامل تھا۔

جس چیز کو اختلاف کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت دراصل اسی قدر تھی کہ کچھ الفاظ کی ادائیگی میں فرق موجود تھا۔ اس کے علاوہ قرآنِ مجید کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مولانا تقی عثمانی، مستدرک حاکم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو نسخہ تیار کروایا تھا اس میں سورتیں مرتب نہ تھیں بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی۔ اب حضرت عثمان کے دور میں ترتیب توقیفی کی بنیاد پر انھیں ترتیب دے کر ایک مصحف میں یکجا کر دیا گیا[۴۲]

حضرت عثمان کے جمع کردہ قرآن مجید میں ایسا رسم الخط اپنایا گیا تھا جس میں تمام

منسوب تک نہیں ہے۔

۴۔ حضرت علیؓ کا دور حکومت مصحف عثمانی کی ترتیب کے بعد ہے۔ سربراہِ مملکت ہونے، حافظِ قرآن ہونے اور محافظِ دین (خلیفہ) ہونے کے ناطے آپ پر فرضِ عین تھا کہ آپ تحریف شدہ مقامات کی اصلاح فرماتے جبکہ ایسا نہیں ہوا۔

آپ کا خاموش رہنا ایک دینی جرم ہوتا۔ کیا کوئی ادنیٰ مسلمان بھی اس کا تصور کر سکتا ہے کہ اس مرتبہ جلیلہ پر فائز ہوتے ہوئے آپ نے قرآن مجید کے بارے میں چشم پوشی سے کام لیا۔ ان تمام باتوں کے بالمقابل آپ نے نہ صرف کسی قسم کی تحریف کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ آپ نے وہی قرآن امت کو دیا جو حضرت عثمان نے مرتب کروایا تھا۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

حضرت علی..... پونے چھ برس تک برسرِ اقتدار رہے۔ ان کا حکم چلتا تھا۔ ان پر کیا دباؤ تھا کہ انھوں نے اصل قرآن جاری نہیں فرمایا۔ امام حسن کو بھی خلافت ملی۔ وہ بھی امام معصوم سمجھے گئے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود کسی کو یہ کس طرح جرأت ہو سکتی ہے کہ ایسی بات کہے..... قرآن میں کوئی حرف زائد یا کم یا تبدیل ہونا ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں جبکہ قرآن میں تبدیلی کی وجہ سے ان حضرات پر جہاد، اہل شام سے لڑائی سے زیادہ اہم اور ضروری تھا[۴۹]

علامہ موصوف اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

حضرت عثمانؓ ایسے وقت میں ہوئے ہیں کہ تمام جزیرۃ العرب مسلمانوں قرآنِ مجید کے نسخوں، مساجد اور قاریوں سے بھرا ہوا تھا۔ قرآ حضرات بچوں بڑوں اور دور و نزدیک کے لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یمن جو ایک وسیع علاقہ تھا، بحرین، عمان جن کی آبادی وسیع اور متعدد دیہاتوں اور شہروں پر مشتمل تھی، مکّہ طائف، مدینہ، شام، جزیرہ، مصر، کوفہ، بصرہ، ان تمام مقامات پر قرآن کے اس قدر نسخے اور قاری موجود تھے کہ ان کا شمار اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اگر حضرت عثمانؓ اس طرح کا ارادہ کرتے، جیسا کہ لوگ بیان کرتے ہیں تو بھی وہ ایسا کرنے پر ہرگز قادر نہیں ہو سکتے تھے..... قرآنِ مجید کے لاتعداد نسخوں کو ختم کر سکنے کی بات تو بہت بڑی ہے اگر کوئی نابغہ یا زہیر کے شعر میں کوئی کلمہ گھٹانا بڑھانا چاہے تو

جائز اور ثابت شدہ قرأتیں سما سکیں۔[۳۳]

اس کے علاوہ اب تک قرآنِ مجید کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو، صرف ایک تھا۔ اب ایک سے زیادہ نقلیں کی گئیں، جو مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ کو بھیجی گئیں اور ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا۔[۳۴]

اس مصحف کی تیاری کے وقت نہ صرف یہ کہ حضرت حفصہؓ والے نسخہ کی ہوبہو نقل تیار کی گئی بلکہ مزید احتیاط کے لیے وہی طریقہ اپنایا گیا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنایا تھا، کہ عہدِ نبوی کی متفرق تحریریں بھی طلب کی گئیں اور ان کا نئے مصحف سے ازسرِنو مقابلہ کیا گیا۔ حضرت زیدؓ نے اس وقت تک کوئی آیت نہ لکھی جب تک کہ وہ ان تحریروں میں بھی نہیں مل گئی۔[۳۵]

ان تمام احتیاطی تدابیر کی روشنی میں حضرت عثمانؓ کے تیار کردہ مصحف کی صحت کے بارے میں کسی بدگمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

بعض حلقوں کی جانب سے یہ نقطۂ نگاہ اختیار کیا گیا ہے کہ:

حضرت عثمانؓ نے قرآنِ مجید سے وہ تمام حصّے نکال دئے جن میں اہل بیت اور حضرت علیؓ کے مناقب و فضائل بیان کیے گئے تھے۔[۳۶]

حضرت عثمانؓ کی جمع قرآن کی کارروائی کے بارے میں حضرت علیؓ کا نقطۂ نگاہ ابن ابی داؤد کے کتاب المصاحف کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے حضرت علیؓ کا وہ تفصیلی بیان بھی نقل کیا ہے جس سے "مصحف عثمانی" کے بارے میں حضرت علیؓ کے نقطۂ نگاہ کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔[۳۷]

اس نقطۂ نگاہ کے سلسلہ میں درج ذیل نکات بھی غور طلب ہیں۔

۱۔ کیا حضرت علیؓ کے سامنے قرآنِ مجید میں تبدیلی اور کمی کر دی گئی اور آپؓ نے اس سلسلے میں کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ خاموش رہے۔

۲۔ حضرت علیؓ خود حافظ قرآن تھے۔ بالفرض اگر حضرت عثمانؓ نے کوئی گڑبڑ کردی تھی تو حضرت علیؓ کو چاہئے تھا کہ وہ اعلان فرماتے کہ یوں تحریفِ قرآن کا ارتکاب کیا گیا ہے اور میں اس کی اصلاح کر رہا ہوں، حالانکہ حضرت علیؓ سے اس قسم کا کوئی بیان

بھی وہ اس پر قادر نہیں ہوگا اور اس تبدیلی کا راز جلد ہی فاش ہو جائے گا اور ثابت شدہ نسخے اس کی مخالفت کریں گے۔ پھر قرآنِ مجید جو کہ لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہے، اس میں اس قسم کی تبدیلی کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔"[۴۹]

اگر ہم اس وقت کے حالات کو نگاہ میں رکھیں جب حضرت عثمانؓ نے قرآن جمع فرمایا تھا، تو اس بات کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت عثمانؓ نے متن قرآن میں کوئی تبدیلی کر دی ہوگی۔ صحابہ کرام کی جراتِ ایمانی کا حال تو یہ تھا کہ دین کی کسی ادنیٰ سی بات سے انحراف کو جائز تصور کرتے اور اس کے اور اس کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ حضرت حسین اپنے خاندان کے ساتھ شہید کر دئے گئے اس لیے کہ وہ فاسق آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بر سرِ عام ایک شخص امیر المومنین حضرت عمرؓ سے استفسار کرتا ہے کہ لوگوں کی قمیصیں تو اتنی لمبی نہیں بن سکیں، تقریر کرنے سے قبل جواب دیں کہ امیر المومنین کی قمیص کس طرح اتنی لمبی بن گئی۔[۵۰]

اس کے مقابلہ میں کسی نے حضرت عثمانؓ کی کارروائی پر اعتراض نہ کیا بلکہ اس سے اتفاق کیا یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔

صحابہ کرامؓ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

من كذب علی متعمدًا	جس نے میرے بارے میں جان بوجھ
فليتبوأ مقعده من النار[۵۱]	کر جھوٹی بات کہی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

ایک اور روایت یوں ہے، حضورؐ نے فرمایا۔

من قال في القرآن برای	جس نے قرآن میں اپنی رائے سے
فليتبوأ مقعده من النار[۵۲]	کوئی بات کہی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

مسلمانوں کا تو بحیثیت قوم مزاج ہی ایسا ہے کہ تحقیق اس کے رگ و ریشے میں رچی بسی ہے۔ انھوں نے تدوینِ حدیث کے سلسلے میں جو تحقیقی روایت چھوڑی ہے اس کی نظیر کسی قوم کے پاس نہ موجود تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں خود اہلِ مغرب کے اعترافات بھی موجود ہیں اور انہوں نے تو اس کی تعریف کی ہی ہے، اس پس منظر میں کوئی دیانتدار محقق یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا کہ حضرت عثمانؓ نے قرآنِ مجید میں تبدیلیاں کر دیں اور لوگ خاموش تماشائی بنے رہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں علمی دیانت داری کا جو معیار تھا اس کے تحت انھوں نے حکم دیا کہ ساتوں نسخوں کو ایک ایک کر کے مسجد نبوی میں ایک شخص باآواز بلند شروع سے آخر تک پڑھے تاکہ کسی شخص کو یہ شبہ نہ رہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید میں تبدیلی کر دی [۵۳]

حضرت عثمانؓ کے تیار کردہ مصحف پر ایک اعتراض یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے آپ کی اس کارروائی پر اعتراض کیا تھا اور ابن مسعودؓ اس نسخہ سے متفق نہ تھے۔ اس سلسلے میں ترمذی شریف کی ایک روایت جس میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے کہ عبداللہ ابن مسعودؓ کو شکایت تھی کہ کتابت قرآن مجید کا کام ان کے سپرد کیوں نہیں کیا گیا۔ جبکہ انھوں نے حضرت زید ابن ثابتؓ کے مقابلے میں زیادہ طویل عرصہ تک حضورؐ کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا [۵۴]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی ہے۔

حضرت عثمانؓ نے یہ کام مدینہ طیبہ میں کیا تھا۔ ابن مسعودؓ اس وقت کوفہ میں تھے۔ حضرت عثمانؓ اس کام کو موخر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضرت زید ابن ثابتؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں تدوین قرآن مجید کا کام کر چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ مرحلہ بھی انہی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچے۔" [۵۵]

حافظ ابن حجر کی اس توجیہ کے علاوہ اس مسئلہ کی وضاحت یوں بھی ہوتی ہے کہ:

حضرت عثمانؓ کو اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا وہ فوری نوعیت کا مسئلہ تھا۔ یہ صحابہؓ کے عمومی مقام و مرتبہ کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اس کا تعلق تجربے سے تھا۔ حضورؐ نے جن صحابہ کرامؓ کے نام بطور قاری کے لوگوں کو بتائے ہوئے تھے ان میں عبداللہ ابن مسعودؓ تھے۔ لیکن تدوین قرآن کا مسئلہ ایسا نہ تھا کہ کسی ماہر قرآن ہی کو اس پر مامور کیا جاتا۔ کیا زید ابن ثابتؓ کے لیے یہ اعزاز کچھ کم تھا کہ حضرت ابن مسعودؓ پر فوقیت رکھنے والے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عثمانؓ سے پہلے تدوین قرآن کے کام پر زید ابن ثابتؓ ہی کو مامور کیا تھا۔ پہلے دو خلفاءؓ نے ابن مسعودؓ کی مدینہ کی موجودگی کے باوجود انھیں تدوین قرآن پر مامور نہ کیا تھا۔ اب تو ابن مسعودؓ مدینہ سے [illegible] ہیں [illegible] سے واضح ہوا کہ حضرات شیخینؓ نے موزوں ترین فرد کو اس کام

پر لگایا تھا۔ دونوں مواقع پر زید ابن ثابتؓ کو مامور کرنا اس وجہ سے بھی تھا کہ وہ حضورؐ کے عہد میں کاتب وحی تھے۔ اگر مسئلہ تفسیر قرآن کا ہوتا تو شاید ابن مسعودؓ اس کام کے لیے موزوں تر ہوتے۔ لیکن یہاں تو مسئلہ ایسے کام کا تھا جس میں زید ابن ثابتؓ کا تجربہ ابن مسعودؓ سے زیادہ تھا۔ حضرت زید ابن ثابتؓ اور ان کی زیر نگرانی کام کرنے والی کمیٹی کے ارکان کو بھی کئی ایک امتیاز حاصل تھے۔ زید ابن ثابتؓ کے بارے میں حضور صلعم نے فرمایا:

من سرہ ان یقرا القرآن	جو شخص قرآن کو تر و تازہ پڑھنا چاہے
غضا فلیقرأہ بقراءۃ زید [۵۶]	تو وہ زید ابن ثابت کی قراءت کو اپنائے

سلیمان بن یسار سے اہلِ مدینہ کی قراءت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

اجتمع علیہا ابن عمر،	اس پر ابن عمر، عثمان، ابی بن کعب
وعثمان، وابیّ وزید وکان	اور زید متفق ہیں اور زید ہمارے نزدیک
زید اقرأھم عندنا۔ [۵۷]	سب سے زیادہ بہتر قاری تھے۔

زید بن ثابتؓ کے بارے میں نور الدین عتر لکھتے ہیں:

وقد بلغ فی الذکاء مبلغًا	وہ ذہانت میں عظیم درجے تک پہنچے
عظیمًا تمیّز بہ علی	ان کی حیثیت ان کے ہم عصروں میں
اھل عصرہ [۵۸]	سب سے ممتاز رہی۔

شعبی کہتے ہیں:

علت رتبۃ زید فی	زید ابن ثابتؓ کا مرتبہ علم فرائض اور
الفرائض والقرآن [۵۹]	علم قرآن میں سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے

ابو عبدالرحمٰن السلمی تابعی کہتے ہیں:

کانت قراءۃ ابی بکر وعمر	ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، زید ابن ثابتؓ
وعثمان وزید بن ثابت	اور مہاجرینؓ وانصارؓ کی قرأت ایک
المہاجرین والانصار	ہی تھی۔ وہ عام قرأت کے مطابق ہی
واحدۃ، کانوا یقرؤون	قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔
القراءۃ العامۃ، وھی	یہ وہی قراءت تھی جس پر حضور اکرمؐ

القراءة التی قرأها رسول اللہ صلعم علی جبریل مرتین فی العام الذی قبض فیہ وکان زید قد شہد العرضۃ الاخیرۃ، وکان یقری ء الناس بہا حتی مات، ولذلک اعتمدہ الصدیق فی جمعہ وولاہ عثمان کتبۃ المصحف[۶۰]

نے جبریل کے سامنے دو مرتبہ قرآن مجید پڑھا تھا جس سال کہ آپ کی وفات ہوئی۔ زید ابن ثابتؓ "عرضۂ اخیرہ" میں موجود تھے اور وہ لوگوں کو اسی کے مطابق پڑھاتے تھے یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن جمع کرتے وقت ان پر اعتماد کیا اور عثمانؓ نے بھی کتابت مصحف کا کام انھیں کے سپرد کیا۔

"نکت الانتصار" میں بھی اس سلسلے میں لکھا ہے۔

...... وغیر ذلک کثیر من الاخبار فی فضلہ وعلو قدمہ فی القرآن الکریم متواترۃ المعنی کما بین اھل التحقیق۔[۶۱]

...... ان اقوال کے علاوہ بھی آپ کے فضائل میں بہت سے اقوال موجود ہیں اور قرآن مجید کے معاملے میں آپ کا بلند مرتبہ ہونا تواتر معنوی کی حد تک ثابت ہے جیسا کہ محققین کا خیال ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب انھیں جمع قرآن کا کام سونپا تھا تو اس وقت ان کے بارے میں آپؓ کے الفاظ یہ تھے:

انک شاب (اورجل) عاقل[۶۲]

بے شک تم عقل مند نوجوان ہو۔

ایک مرتبہ لوگوں سے سوال کیا:۔

من اکتب الناس ؟ قالوا کاتب رسول اللہ صلعم زید بن ثابت، قال فای الناس اعرب ؟ قالوا سعید بن العاص، قال عثمان فلیمل سعید ولیکتب زید[۶۳]

سب سے اچھا کاتب کون ہے؟ کہا گیا کہ رسول اللہ کے کاتب زید ابن ثابتؓ۔ آپؓ نے پوچھا سب سے زیادہ عربی کا ماہر کون ہے؟ کہا گیا کہ سعید بن العاصؓ ہیں۔ آپؓ نے فرمایا سعید لکھائیں اور زید لکھیں۔

ایک دوسری روایت میں سعید بن العاصؓ کے بارے میں حضرت عثمانؓ کا سوال یوں ہے:

ای الناس افصح؟ قالوا	لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح کون ہے؟
سعید بن العاص[۶۴]	لوگوں نے کہا سعید بن العاص۔

ان روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت زید ابن ثابتؓ کو ان کے مخصوص امتیازات کی وجہ ہی سے جمع قرآن کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا تھا۔

ان تفصیلات کی روشنی میں ہم بجا طور پر مستشرق بہل (Buhl) کے اس نقطۂ نگاہ کی تردید کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید لکھنے والے لوگ نو آموز اور ناتجربہ کار تھے اور ان کی طرف سے کچھ لاپرواہی کا مظاہرہ ہوا اور قرآن مجید میں کچھ غلطیاں باقی رہ گئیں[۶۵]۔

حضرت عثمانؓ کے تیار کردہ نسخہ پر ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ:

آپ کے سامنے آپ کا تیار کردہ نسخہ لایا گیا تو آپ نے فرمایا:

ان فی القرآن لحنا ستقیمه	"بے شک قرآن مجید میں "لحن" ہے۔ عرب
العرب بالسنتهم[۶۶]	اپنی زبان سے اسے درست کریں گے"۔

اس سلسلے میں علامہ محمود آلوسی نے وضاحت کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں

لم یصح عن عثمان اصلا[۶۷]	یعنی یہ روایت حضرت عثمانؓ سے بالکل ثابت نہیں۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

مصحف عثمانؓ پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ رسم عثمانی وحی سے بھی ثابت ہے۔ حدیث نبوی کی رُو سے غلطی پر اجماع ہو ہی نہیں سکتا۔

اس روایت میں مذکور ہے حضرت عثمانؓ نے "جمع قرآن کمیٹی" کے ارکان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

احسنتم واجملتم[۶۸]	یعنی تم نے اچھا اور عمدہ کام کیا ہے۔

اگر اس کام میں کوئی غلطی ہوتی تو آپ اس غلطی کی تحسین کیوں کر فرما سکتے تھے۔

ابو عبیدہ نے عبدالرحمٰن بن ہانی سے نقل کیا ہے کہ میں حضرت عثمانؓ کے پاس تھا کہ کاتبانِ مصاحف، مصحف کے حصے آپ کے سامنے پیش کرتے تھے تو اس میں لم یتسنّ، لاتبدیل للخلق اور امهل الکافرین لکھا ہوا تھا۔ آپ

نے تینوں مقامات پر قلم دوات منگوا کر غلطی کی اصلاح فرمادی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ ذاتی طور پر مصحف کو چیک کرتے تھے اور غلطیوں کی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ اس اعتراض کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ یہاں "لحن" سے مراد غلطی نہیں بلکہ قرآن کے وہ صحیح الفاظ مراد ہیں جو اہلِ عرب کی زبان پر چڑھے ہوئے نہ تھے اور یہ الفاظ ان کی طرزِ گفتار کے مطابق نہ تھے۔ ایسے الفاظ کے بارے میں حضرت عثمانؓ نے فرمایا تھا قرآنِ مجید میں ایسے انداز کے الفاظ ہیں جنھیں عرب بار بار پڑھنے سے صحیح طور پر پڑھنے لگیں گے اور ان کی زبانیں رفتہ رفتہ اس طرز پر پڑھنے کی عادی بن جائیں گی۔

اس میں شک نہیں کہ لفظ "لحن" دو معنوں میں مشترک ہے۔ ایک معنیٰ غلطی ہے اور ایک معنی طرزِ کلام۔ یہاں دوسرا معنیٰ مراد لیا جائے گا۔ یہی معنیٰ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں بیان کیا ہے کہ اسے "لحن محمود" کہا جاتا ہے۔ اسی کے متعلق شاعر کہتا ہے۔

خیر الحدیث ما کان لحنا

اچھی بات وہ ہے جو ایک خاص طرز سے کہی جائے

یہی معنیٰ خود قرآنِ مجید کی آیتِ مبارکہ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ میں استعمال کیا گیا ہے۔

بخاری شریف میں حضورؐ کا ایک فرمان موجود ہے۔

لعل بعضکم ان یکون الحن	یعنی فریقین مقدمہ میں سے کبھی ایک
بحجته من بعض فاقضی له	فصیح طرزِ کلام کا ماہر ہوتا ہے میں اس
علی نحو ما اسمع منه فمن	کی بات سن کر فیصلہ کر دیتا ہوں۔ لہٰذا اگر
قضیت له بشئ من اخیه فلا یاخذنه	کسی بھائی کا حق اسے میں دیدوں تو وہ اسے ہرگز نہ
فانما اقطع له قطعة من النار (بخاری مسلم)	لے۔ یہ اس کے حق میں آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔

ایک وضاحت یہ بھی کی گئی ہے کہ "لحن" سے رسم الخط کا لحن مراد ہو کہ رسمِ مصحفِ عثمانی میں بعض جگہ ملفوظ اور مکتوب الفاظ موافق نہیں لیکن عرب اہلِ زبان اپنی زبان سے اسے درست پڑھ لیں گے۔

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:

اس روایت کی سند منقطع اور مضطرب ہے اور اس کے راوی ضعیف ہیں[۶۹]۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت عثمان کے نسخہ میں کوئی غلطی نہ تھی اور نہ ہی حضرت عثمانؓ نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ تدوین کمیٹی کے تیار کردہ نسخے میں غلطیاں ہیں اور لوگ خود انھیں درست کریں گے۔ اس طرح ان روایات سے قرآن مجید کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حضرت عثمانؓ کے تیار کروائے ہوئے مصحف کے بارے میں ہم نے چند باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اہل مغرب نے شیعہ مآخذ کو بنیاد بناتے ہوئے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی اس کارروائی کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہوا اور قرآن مجید کے متن میں غلطیاں موجود رہیں اہل مغرب نے محض قیاس آرائیوں کی بنیاد پر یہ غلط بیانیاں کی ہیں۔ ورنہ حقائق ان کے موقف کی تائید نہیں کرتے۔

اہل مغرب کے اسی متعصبانہ اور معاندانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کی اس کارروائی کے بارے میں کوئی ایک فیصلہ نہیں کر سکے۔ اور صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ محض قیاس آرائیوں اور ظن وتخمین سے کام لے رہے ہیں۔ ان کے فیصلوں میں زمین و آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ قرآن مجید اس سے قبل اصل حالت میں موجود تھا لیکن حضرت عثمانؓ نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا[۷۰]۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قرآن کے متن کا کھوج لگانے کی پہلی کوشش ہی حضرت عثمانؓ نے کی[۷۱] ایک گروہ کہتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا یہ نسخہ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تیار کردہ نسخہ کی من و عن نقل تھی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ والا نسخہ غیر مرتب قسم کا تھا، لہٰذا حضرت عثمانؓ کا نسخہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا[۷۲]۔ (گویا یہ گروہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے کوئی تصرف نہیں کیا بلکہ محض ایک نسخہ سے دوسرا نسخہ نقل کروالیا)

نولڈیکے، جس کے نقطہ نگاہ کو اکثر مغربی علماء نے مقلدانہ انداز سے اپنایا ہے حضرت عثمانؓ کی ساری کارروائی کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دیتا ہے[۷۳] لیکن ایک دوسرا گروہ پورے تیقن کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ آپ کی کارروائی نہایت احتیاط کے ساتھ ہوئی[۷۴] ایک گروہ اس بات کو اچھالتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد تک

قرآنِ مجید کے متن میں اختلافات پیدا ہو چکے تھے[۳] دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس قسم کی کوئی بات نہ تھی، حضرت عثمانؓ نے تو یہ سب کچھ محض اپنی اہمیت جتانے کے لیے کیا[۴]

ایک گروہ کہتا ہے کہ قرآنِ مجید لکھنے والے صحابہؓ، قابلِ اعتماد نہ تھے[۵] جبکہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کاتبانِ وحی کے تقویٰ میں کسی بھی قسم کا شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے[۶]

معترضین کے اعتراضات کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ سب کچھ ظن و تخمین اور قیاس آرائی کی بنیاد پر کہتے ہیں ان کی قیاس آرائیوں کی تردید کرنے والے ثقہ شواہد موجود ہوتے ہیں، تب بھی وہ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر ذی ہوش انسان فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایک طرف ثقہ شواہد اور تحقیق شدہ حقائق ہوں اور دوسری جانب قیاس آرائیاں ہوں، تو قیاس آرائی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

یہ تضادات اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ کسی واضح فیصلہ تک نہیں پہنچ پائے لیکن اسلام دشمنی اور تعصب میں وہ مخالفت کرنے پر مجبور ہیں اور اسی مجبوری میں وہ مخالفت برائے مخالفت کرتے چلے جاتے ہیں۔

مصادر و مراجع

۱۔ بحوالہ صبحی صالح، ڈاکٹر، مباحث فی علوم القرآن، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۷۹
یہی نقطۂ نگاہ دیگر لوگوں نے بھی اختیار کیا مثلاً Noldeke, T. Sketches from Eastern History, Khayat, PP. 50

۲۔ ایضاً ص ۵۲

۳۔ بحوالہ صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن، ص ۸۰-۷۹۔ حقانی، عبدالحق، البیان فی علوم القرآن، ص ۲۵۸

۴۔ بحوالہ مباحث فی علوم القرآن ص ۷۹

۵۔ عبداللہ ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، المطبعۃ الرحمانیہ، مصر، ۱۹۳۶، صفحہ ۱۴-۱۶

۶ بہل (Buhl) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد دوم، ص ۱۰۷۳
۷ عبداللہ ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ص ۱۴-۱۶
۸ سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، المطبعۃ التجاریہ، مصر، جلد اوّل، ص ۶۰
۹ عبداللہ ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، صفحہ ۳۲
۱۰ بخاری محمد بن اسماعیل، امام، الجامع الصحیح، جلد سوم، ص ۱۲۶۔ اس کے علاوہ یہ روایت تمام کتب صحاح میں موجود ہے۔
۱۱، ۱۲ سیوطی، جلال الدین، الاتقان، جلد اول، ص ۶۱
۱۳ تقی عثمانی، مولانا، علوم القرآن، مکتبہ دار العلوم، کراچی، صفحہ ۱۸۷
۱۴ نزل القرآن علی سبعۃ احرف۔ یہ حدیث اکیس صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔ ابو عبید نے اسے متواتر قرار دیا ہے۔ حضور اکرم صلعم نے فرمایا "جبریل نے مجھے قرآنِ مجید سات حروف میں پڑھایا۔ میں زیادت طلب کرتا رہا۔ وہ بڑھاتے گئے یہاں تک کہ سات حروف تک نوبت پہنچی"۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات کے لیے سیوطی، الاتقان، جلد اوّل، ص ۴۵ دیکھئے
۱۵ ایضاً ص ۶۱۔ اس سلسلے میں علامہ زرکشی لکھتے ہیں: ولم یحتج الصحابۃ فی ایام ابی بکر وعمر الی جمعہ علی وجہ ما جمعہ عثمان لانہ لم یحدث فی ایامہما من الخلاف فیہ ماحدث فی زمن عثمان، ولقد وفق لامر عظیم ورفع الاختلاف وجمع الکلمۃ واراح الامۃ
زرکشی، البرہان فی علوم القرآن، جلد اوّل، ص ۲۳۹ ۱۶ ایضاً ص ۲۳۹
۱۷ سیوطی، الاتقان، جلد اول، ص ۶۱ حضرت عثمانؓ کے نسخہ کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں:
اس کارروائی کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ آپؓ نے قرآنِ مجید کی نقلیں تیار کروائیں۔ املا میں کہیں کہیں ترمیم کی گئی۔ لفظ کی آواز کو نہیں بدلا گیا۔ لیکن اس آواز کی املا کو کچھ بدلا گیا۔ اس کے بعد اس کے چار یا سات نسخے تیار کیے گئے .... اسلامی مملکت میں یہ نسخے پھیلائے گئے اور کہا گیا کہ آئندہ نسخے انھیں سے نقل کر کے تیار کئے جائیں اور اس کے علاوہ نسخوں کو تلف کر دیا گیا۔
حمید اللہ، ڈاکٹر، خطباتِ بہاولپور، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۲۴
۱۸ الزرقانی، محمد عبد العظیم، مناہل العرفان، جلد اول، ص ۲۵۳-۲۵۴
۱۹ ابن حزم، کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل، جلد دوم، ص ۸۱-۸۲
۲۰ حقانی، عبدالحق، مولانا، البیان فی علوم القرآن، ص ۵۱-۵۲

۲۱ الزرقانی۔ مناہل العرفان، جلد اول، ص۲۶۸-۲۷۲

۲۲ ابن الجزری، النشر فی القراءات العشر، المکتبۃ التجاریہ، مصر، جلد اول، ص۳۱

۲۳ ابن حزم، کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل، جلد دوم، ص۷۷-۷۸

۲۴ عینی، بدرالدین، علامہ، عمدۃ القاری (کتاب الخصومات) جلد ۱۲ ص۲۵۸

۲۵ زرکشی، البرہان فی علوم القرآن، داراحیاء الکتب العربیہ، جلد اول، ص۱۵۱

۲۶ علی القاری۔ علامہ، مرقاۃ المفاتیح، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۳۸۷ھ جلد پنجم

۲۷ الزرقانی، مناہل العرفان، جلد اول، ص۱۵۱

۲۸ شاہ ولی اللہ، المصفیٰ، مطبعہ فاروقی، دہلی، صفحہ ۱۸۷

۲۹ انورشاہ کشمیری، فیض الباری، مطبع حجازی، مصر، ۱۳۵۸ھ، جلد سوم، ص۳۲۱-۳۲۲

۳۰ زاہد الکوثری، علامہ، مقالات الکوثری، مطبعہ الانوار، قاہرہ، ۱۳۷۲ھ، ص۲۰-۲۱

۳۱ انورشاہ کشمیری، فیض الباری، جلد سوم ص۳۲۱-۳۲۲

۳۲ زاہد الکوثری، مقالات کوثری، ص۲۱ (ہ) ۳۲ زرکشی، البرہان، جلد اول، ص۲۴

۳۳ عبداللہ ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ص۲۵

۳۴ بخاری، الجامع الصحیح، جلد سوم، ص۱۲۶

۳۵، ۳۶ بحوالہ صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن ص۷۹

۳۷ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد نہم، ص۱۳-۱۵

۳۸ سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، جلد اول، ص۶۱

۳۹ مقری، نفح الطیب، جلد اول ص۳۹۸

۴۰ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء، جلد دوم، ص۵

۴۱ عبداللہ ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ص۲۲

۴۲ حاکم، امام، مستدرک حاکم، جلد دوم، ص۲۲۹

۴۳ الزرقانی، مناہل العرفان، حاکم اول ص۲۵۳-۲۵۴

۴۴ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد نہم ص۱۷ ۴۵ ایضاً ص۱۵

۴۶ ضربت عیسوی، تاویل القرآن، ص۱۰۶-۱۰۷ دیگر کئی ایک مستشرقین نے بھی یہی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے۔ (i) Arthur Jeffery, Material for the History of text

of the Quran, PP. 10
(ii) Bhul, Encyclopaedia of Islam, vol II PP. 1073
(iii) Margoliuth, Mohammadanism, PP. 70

(۱۷) فنڈر پادری، میزان الحق، ص۳۶، ۴۴۔ (ان سب لوگوں نے شیعہ مآخذ کے حوالے سے یہ نقطۂ نگاہ اپنایا ہے)

۴۷ھ سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، جلد اول، ص۶۰

۴۸ھ ابنِ حزم، کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل، مطبع الادبیہ، مصر ۱۳۲۰ھ جلد دوم، صفحہ ۶۱

۴۹ھ ایضاً، جلد دوم ص۱۰۷ ۵۰ھ حسین ہیکل، عمر فاروق، مطبعہ مصر شرکۃ المصریہ ۱۳۶۴ھ جلد دوم ص۲۱۴

۵۱ھ مسلم، امام، الجامع الصحیح، مطبع محمد علی، مصر ۱۳۳۴ھ، جلد اول، ص۸۰

۵۲ھ بحوالہ ابنِ کثیر، محمد بن اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم، (مقدمہ) مطبعہ مصطفیٰ محمد ۱۹۲۸، جلد اول، ص۵

۵۳ھ حمید اللہ، ڈاکٹر، خطبات بہاول پور، ص۲۴

۵۴، ۵۵ھ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد نہم، ص۱۶-۱۷

۵۶ تا ۵۹ھ نور الدین عتر، محاضرات فی علوم القرآن، مطبعۃ دار الکتاب، دمشق ۱۹۹۱۔ ص۵۴

۶۰ھ الزرکشی، البرہان فی علوم القرآن، جلد اوّل، ص۲۳۷

۶۱ھ بحوالہ نور الدین عتر، محاضرات فی علوم القرآن، ص۵۴

۶۲ تا ۶۴ھ عبد اللہ بن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ص۲۴

۶۵ھ بہل (Bhul) کی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ص۱۰۷۳

۶۶ھ عبد اللہ بن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ص۳۲ ۶۷ تا ۶۹ھ آلوسی، روح المعانی، جلد اول، ص۲۸

۷۰ھ ضربت عیسوی، تاویل القرآن، صفحہ ۱۰۶-۱۰۷ ۔ آرتھر جیفری کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اگر ہم حضرت عثمانؓ سے قبل کی قرآن کی قرائتیں تلاش کرنا چاہیں تو یہ بالکل عبث ہوگا۔ قرآن پورا تھا لیکن آپ نے ضائع کردیا۔ حالانکہ اس کے لکھے ہوئے مقدمہ کے پہلے ہی صفحہ پر وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی قرآن کے متن کو اکٹھا کرنے کی باقاعدہ کوشش ہی نہیں کی۔ اس سلسلے میں دیکھئے: Arther Jeffery,
Material for the History of the Text of the Quran (Preface) PP. I

۷۱ھ آرتھر جیفری، حوالہ سابق۔ نیز Naldeke, T. Sketches from Eastern-History, Khyat Berut, PP. 51.

72. Bhul, Encyclopaedia of Islam, PP. 1037

۷۳ Noldeke, Sketches from Eastern History, PP. 51.

۷۴ بحوالہ صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن، صـ۸۰

۷۵ Arther Jeffery, Material for the History of the Text of the Quran, PP. II

۷۶ (i) Noldeke, Sketches from Eastern History, PP. 50

(ii) Nicholson, Literary History of the Arabs (Preface) PP. XII. XIII

۷۷، ۷۸ بحوالہ صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن، صـ۸۰

ادارہ ادب اسلامی ہند کی مطبوعات

تماشائی — م۔نسیم کی افسانوی کاوشوں کا مجموعہ۔ صفحات ۲۵۶ — قیمت: ۵۰ روپئے

متاع آخر شب — حفیظ میرٹھی کا شعری مجموعہ صفحات ۱۶۰ — قیمت: ۴۰ روپئے

حفیظ میرٹھی — فن اور شخصیت ـ ترتیب عزیز بگھروی انتظار نعیم صفحات ۲۵۶ — قیمت: ۷۰ روپئے

جہاد حرف — عزیز بگھروی کا اولین شعری مجموعہ۔ صفحات ۱۴۴ — قیمت: ۲۵ روپئے

ناموس قلم — عزیز بگھروی کا دوسرا شعری مجموعہ صفحات ۱۴۴ — قیمت: ۴۰ روپئے

ملنے کے پتے
ادارۂ ادب اسلامی ہند ۲۷۰۳۔ بارہ دری بلیماران۔ دھلی ۶
مرکزی مکتبہ اسلامی۔ بازار چتلی قبر۔ دھلی ۶
ھندوستان پبلیکیشنز کمپنی۔ گلی قاسم جان۔ دھلی ۶

JUST OUT!

Focus on Palestine (Part I)

The first part of the ***Muslim & Arab Perspectives'*** special issue, '**Focus on Palestine**,' has been just released. Its 116 pages are packed with many interesting and informative articles on various fundamental aspects of the Palestinian Question, including a major article on the history of Palestine from the first Jewish invasion in 1220BC to the Oslo Accord, by Dr Zafarul-Islam Khan, an expert on Palestine and the Middle East. The second part of the '**Focus on Palestine**' will concentrate on aspects of the Palestinian Question not disscussed in this part. The third part will deal with Jerusalem. Send Rs 45/ US$7/£5 (by airmail) for your copy of this important publication or, better still, save considerably by subscribing at the following yearly rates*:

	Individual	Institution
India	Rs150	Rs300
Foreign (by airmail)	$25/£15	$46/£30

*Pl. add $2 if cheque payable outside India.

THE INSTITUTE OF ISLAMIC AND ARABIC STUDIES
P.O.Box 9701, 84 Abul Fazl Enclave, New Delhi 110025

ترجمان القرآن فراہیؒ کا مسلک حدیث

(۲)

مولانا سلطان احمد اصلاحی

'لکل فن رجال' کے مصداق آدمی کو کمال اور مہارت ایک ہی میدان میں حاصل ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا اس سے اہم تر پہلو یہ کہ کسی شخصیت کی اہمیت اور اس کی اصل قدر و قیمت اس کے اپنے اختصاص کے میدان میں ہی متعین ہوتی ہے۔ اس کے لحاظ سے مولانا فراہیؒ کی دقت نظر اور نکتہ آفرینی کا اصل جوہر خالص قرآن اور ادب عربی کے ساتھ تاریخ القرآن کے ضمن میں ان کے انکشافات اور نادر تحقیقات میں کھلتا ہے۔ بلاشبہ اس میدان میں ایک طرح سے انھیں اجتہاد کا درجہ حاصل ہے اور اس خصوص میں ان کی تلاش و تحقیق کے نتائج غیر معمولی اہمیت اور قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ مشتے از خروارے کے طور پر اس کی مثال میں حضرت ہاجرہؓ کی حضرت سارہؓ کی خدمت گزاری اور سیدنا ابراہیمؑ کی طرف سے حضرت اسماعیلؑ کو شیر خواری کی عمر میں انتہائی بے کسی کے عالم میں سرزمین مکہ میں چھوڑ دینے کی دو روایتوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ترجمان القرآن فراہیؒ نے اپنے معرکۃ الآرا رسالے 'ذبیح' میں ان دو واقعات کی تردید صرف صحف یہود کے حوالہ سے کی ہے لیکن اس کا براہ راست اثر صحیح بخاری کی متعلقہ روایات پر پڑتا ہے، 'اصح الکتاب بعد کتاب اللہ' میں جن کا تذکرہ ایک سے زیادہ مقامات پر کیا گیا ہے۔

۱۔ صحیح بخاری میں حضرت ہاجرہؓ کی حضرت سارہ کی خدمت گزاری کا کذب ابراہیمؑ والی اس روایت میں بھی ہے جس کا حوالہ اس سے پہلے گزرا۔ اس کے مطابق ملک جبار نے حضرت سارہؓ کی کرامات سے ششدر ہو کر بعض دوسری روایات کے مطابق اپنی بیٹی[۱] ہاجرہ کو ان کی خدمت کے لیے دے دیا۔ فاخدمها هاجر۔ جس کے آخر میں اس کے

---

[۱] بخاری جلد ۱۔ کتاب الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا۔

راوی حضرت ابوہریرہؓ کا یہ کہنا بھی ہے کہ:

فتلک امکم یا بنی السماء

اس کے علاوہ بخاری شریف میں یہ روایت دوسرے مقامات پر بھی ہے[1]۔ جہاں حضرت ہاجرہؓ کی حضرت سارہؓ کی خدمت گذاری کا یہ تذکرہ تقریباً انہی الفاظ میں مذکور ہے۔

۲۔ صحیح بخاری کی دوسری روایت سیدنا ابراہیمؑ کی طرف سے حضرت اسماعیلؑ کو شیر خواری کی عمر میں سرزمین مکہ میں بے یار و مددگار اپنی ماں ہاجرہ کے ساتھ تنہا چھوڑ آنے کی ہے۔ یہ ایک طویل روایت ہے جس کا ابتدائی حصہ ہماری زیر نظر گفتگو سے متعلق ہے۔ اس کی عبارت ہے:۔

عن سعید بن جبیر قال	حضرت سعید بن جبیر (تابعی م ۹۵ھ[2])
ابن عباس اول ما اتخذ النساء	سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن
المنطق من قبل ام اسماعیل	عباسؓ نے فرمایا کہ سب سے پہلے عورتوں
اتخذت منطقا لتعفی اثرھا	نے جو کمر بند باندھنا سیکھا تو وہ حضرت اسماعیلؑ
علی سارۃ ثم جاء بھا ابراھیم	کی ماں سے سیکھا جنھوں نے کمر بند اس
وبابنھا اسماعیل وھی ترضعه	مقصد سے باندھا کہ (اس کے سہارے
حتی وضعھما عند البیت عند	لمبے غرارے یا سائے کے ذریعہ) اپنے
دوحة فوق زمزم فی اعلی	نقوش پا کو مٹا سکیں جس کی وجہ سے
المسجد ولیس بمکة یومئذ	حضرت سارہ ان کا پیچھا کرنے میں کامیاب
احد ولیس بھا ماء فوضعھما	نہ ہو سکیں پھر ایسا ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ
ھنالک ووضع عند ھما	انھیں اور ان کے بیٹے اسماعیلؑ کو لے
جرابا فیه تمر وسقاء فیه	کر آئے یہاں تک کہ انھیں خانۂ کعبہ کے

---

[1] بخاری جلد ۱ کتاب البیوع، باب شری المملوک من الحربی وہبۃ الخ۔ نیز کتاب مذکور، باب قبول الہدیہ جس میں یہ ترتیب: ۱۔ اخدموا الی ابراہیم واعطوہا آجر اور ۲۔ فقال اعطوہا آجر کے الفاظ ہیں۔ ان میں اول الذکر روایت مفصل اور دوسری اسی قدر مختصر ہے۔

[2] حجاج بن یوسف نے آپ کو شعبان ۹۵ھ میں قتل کرادیا تھا جبکہ آپ کی عمر کل پچاس سال تھی۔ اسماء الرجال للخطیب التبریزی صاحب المشکوٰۃ ملحقاً بآخر المشکوٰۃ، کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔ بدون سنہ

ماء ثم قفى ابراهيم منطلقا فتبعته ام اسماعيل فقالت يا ابراهيم اين تذهب وتتركنا في هٰذا الوادي الذي ليس فيه انيس ولا شيء فقالت له ذالك مرارا وجعل لا يلتفت اليها فقالت له آلله امرك بهٰذا قال نعم قالت اذن لا يضيعنا ثم رجعت فانطلق ابراهيم حتى اذا كان عند الثنية حيث لا يرونه استقبل بوجهه الى البيت ثم دعا بهٰؤلاء الدعوات ورفع يديه فقال "رب انى اسكنت من ذريتي بواد غير ذي زرع عند بيتك المحرم حتى بلغ يشكرون" الخ[1]

پاس چاہ زمزم کے بالائی حصے میں ایک بڑے درخت کے نیچے لاکر ڈال دیا۔ ان دنوں مکہ میں کوئی آدم آدم زاد نہ تھا اور نہ وہاں پانی کا کوئی سراغ تھا۔ تو انھوں نے ان دونوں کو وہاں لاکر ڈال دیا اور ان کے پاس ایک تھیلا رکھ دیا جس میں کھجوریں تھیں اور ایک مشکیزہ جس میں پانی تھا اس کے بعد ابراہیمؑ الٹے پاؤں واپس جانے لگے تو اسماعیلؑ کی ماں ان کے پیچھے ہولیں چنانچہ انھوں نے پوچھا اے ابراہیمؑ آپ کہاں جارہے ہیں اور ہم لوگوں کو اس وادی میں چھوڑے جارہے ہیں جہاں نہ کوئی ہمدم وہمساز ہے۔ نہ دور دور تک کہیں کسی چیز کا پتہ ہے۔ تو انھوں نے ان سے یہ بات کئی بار کہی۔ لیکن ان کا حال تھا کہ وہ مڑ کر دیکھنے کو تیار نہ تھے۔ اس پر انھوں نے ان سے کہا کہ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی کا حکم دیا ہے۔ انھوں نے کہا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ پھر تو کوئی بات نہیں۔ وہ ہمیں ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ اس کے بعد وہ واپس آگئیں اور اب ابراہیم آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ جب وہ ایک پہاڑی کے پاس پہنچے جہاں سے انھیں کوئی نظر نہ آتا تھا تو وہ اپنا رخ خانہ خدا

---

[1] بخاری جلد ۱ ۔ کتاب الانبیاء، باب یزفون النسلان فی المشی ۔

کی طرف کر کے کھڑے ہو گئے اور دعا کے
یہ الفاظ کہے ساتھ ہی اس کے لیے اپنے
ہاتھ اٹھا لیے۔ انھوں نے کہا: اے میرے
رب میں نے اپنی اولاد کو تیرے قابلِ احترام
گھر کے پاس ایک بے آب وگیاہ وادی
میں لابسایا ہے یہاں تک کہ وہ آیتِ کریمہ
کے الفاظ ’یشکرون‘[1] تاکہ وہ تیرا شکر
ادا کریں‘ تک پہنچ گئے۔

اسی باب میں اس سے قبل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مختصر روایت کے ان سے اس کے راوی سعید بن جبیرؒ نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں :

قال اقبل ابراهيم
باسماعيل وامه وهي
ترضعه معها شنة[2]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا
کہ حضرت ابراہیمؑ اسماعیلؑ اور ان کی ماں
کو لے کر جس وقت (مکہ) آئے تو وہ انھیں
دودھ پلا رہی تھیں اور ان کے ساتھ ایک
مشکیزہ تھا۔

صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں حضرت ہاجرہ سے حضرت سارہ کی رقابت اور اس کے نتیجے میں سیدنا ابراہیم کی اول الذکر کی اپنے بیٹے کے ساتھ مہاجرت کی مزید تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کو بھی ہم اس کے اصل الفاظ میں ہی نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں :

وكان السبب في
ذلك ان سارة كانت
وهبت هاجر لابراهيم
فحملت منه باسماعيل

اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت سارہ نے
حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیم کے لیے
دے دیا تھا۔ تو ان سے ان کے ہاں
اسماعیل حمل میں ٹھہرے تو جب ان کے
ہاں ان کی پیدائش ہوئی تو سارہ کو ان سے

---

[1] یہ پوری آیت کریمہ اپنے سلسلۂ آیات کے ساتھ آگے آرہی ہے۔ [2] بخاری، حوالہ سابق۔

فلما ولدته غارت	رشک ہوا۔چنانچہ انھوں نے قسم کھائی
منها فحلفت لتقطعن	کہ وہ ان کے جسم کے اعضاء کاٹے بغیر نہ
منها ثلاثة اعضاء فاتخذت	رہیں گی۔اس کے بچنے کے لیے ہاجرہؓ نے
هاجر منطقا فشدت	ایک کمربند تیار کیا اور اس سے اپنی کمر
به وسطها وهربت	باندھی۔اس کے بعد وہ بھاگ نکلیں
وجرت ذيلها لتخفى	اور (کمربند سے بندھے) اپنے (لمبے) دامن
اثرها على سارة[1]	کو وہ اپنے پیچھے گھسیٹتی رہیں جس سے
	کہ ان کے نشانِ پا سارہؓ کو نظر نہ آسکیں۔

آگے اسی سلسلے میں ایک دوسری بات کہی گئی ہے:

ويقال ان ابراهيم	یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے
شفع فيها وقال لسارة	ہاجرہؓ کے حق میں منت سماجت کی اور
حللي يمينك بان تثقبي	سارہ سے درخواست کی کہ وہ اپنی قسم
اذنيها وتخفيضها وكانت	کو اس طرح پوری کریں کہ ان کے دونوں
اول من فعل ذلك[2]	کان چھید دیں ساتھ ہی ان کا ختنہ کردیں۔
	چنانچہ پہلے پہل انھیں سے ان کاموں کا آغاز ہوا۔

تیسری روایت میں تنہا اسی واقعہ کو سیدنا ابراہیمؑ کی اس مہاجرت کی وجہ قرار دی گئی ہے:

ويقال ان سارة	یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سارہؓ کا رشک و
اشتدت بها الغيرة	رقابت غیر معمولی طور پر بڑھ گیا تھا جس
فخرج ابراهيم باسماعيل	کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کو مجبور ہو کر
وامه الى مكة لذلك[3]	اسماعیل اور ان کی ماں کو لے کر مکہ
	کی طرف نکل جانا پڑا۔

اس سلسلے کی آخری روایت جو مجاہد اور دوسرے لوگوں سے ہے اس میں اس

---

[1] فتح الباری شرح صحیح البخاری: ۲۵۱/۶، مطبعہ خیریہ، مصر ۱۳۲۵ھ طبعہ اولیٰ
[2] حوالہ سابق [3] حوالۂ مذکور

واقعے کی تفصیل تو اس سے مختلف ہے لیکن سیدنا اسماعیل کے شیر خواری میں مکہ پہنچنے کا تذکرہ اس میں بھی اسی طرح موجود ہے۔[۱]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ہم صحیح بخاری اور اس کی شرح کے ساتھ اس سلسلے میں توراۃ کے بیان پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ کتاب مقدس، پرانے عہد نامے کی کتاب پیدائش کے اکیسویں باب میں ہے:

تب ابراہیم نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اسے ان کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے اسے رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیرسبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی ٥ اور جب مشک کا پانی ختم ہوگیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ٥ اور آپ اس کے مقابل دور ایک پتھر پر جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی ٥ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے ٥ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔[۲]

اس سے پہلے اسی کتاب میں اس واقعے کی مزید تفصیل میں ہے:

'اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے ٥ تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا ٥ پر ابراہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی ٥ اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے، جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اس کی بات مان کیونکہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا ٥ اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے۔[۳]

اس کے ساتھ ہی کتاب پیدائش کے باب سولہ کے مضمون پر بھی ایک نظر ڈالنی

---

[۱] حوالہ سابق [۲] کتاب مقدس پرانا عہد نامہ پیدائش باب: ۲۱، ۱۴–۱۸
[۳] حوالہ سابق آیات ۹ تا ۱۳۔

مناسب ہے جس سے صحیح بخاری میں مذکور حضرت ہاجرہ کی حضرت سارہ کی خدمت گزاری کی تفصیل سامنے آتی ہے۔

" اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا o اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے۔ سو تو میری لونڈی کے پاس جا شاید اس سے میرا گھر آباد ہو اور ابرام نے ساری کی بات مانی o اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے o اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ ہو گئی تو اپنی بی بی کو حقیر جاننے لگی۔ تب ساری نے ابرام سے کہا کہ جو ظلم مجھ پر ہوا وہ تیری گردن پر ہے۔ میں نے اپنی لونڈی تیری آغوش میں دی اور اب جو اس نے آپ کو حاملہ دیکھا تو میں اس کی نظروں میں حقیر ہو گئی۔ سو خداوند میرے اور تیرے درمیان انصاف کرے o ابرام نے ساری سے کہا کہ تیری لونڈی تیرے ہاتھ میں ہے جو تجھے بھلا دکھائی دے تو اس کے ساتھ کر۔ تب ساری اس پر سختی کرنے لگی اور وہ اس کے پاس سے بھاگ گئی o اور وہ خداوند کے فرشتے کو بیابان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس ملی۔ یہ وہی چشمہ ہے جو شور کی راہ پر ہے o اور اس نے کہا اے ساری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی اور کدھر جاتی ہے؟ اس نے کہا میں اپنی بی بی ساری کے پاس سے بھاگ آئی ہوں o خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا تو اپنی بی بی کے پاس لوٹ جا اور اپنے کو اس کے قبضہ میں کر دے اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا یہاں تک کہ کثرت کے سبب سے ان کا شمار نہ ہو سکے گا o اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اس کا نام اسماعیل رکھنا اس لیے کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا o وہ گور خر کی طرح مرد آزاد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا [1]

---

[1] پیدائش باب ۱۶۔ آیات: ۱—۱۲۔

عہدنامۂ قدیم کی ان تفصیلات سے خاص طور پر سیدنا اسماعیلؑ کی نسبت سے ہمارے خط کشیدہ جملوں کی روشنی میں کتاب مقدس کی سخت جانی کا تو ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ یہود کی بے رحمانہ تحریفات کے باوجود اس کے اندر حق وصداقت کی چنگاریاں کس طرح باقی رہ گئیں، اصل غرض یہ کہ صحیح بخاری اور اس کی شرح کے حوالہ سے سیّدنا اسماعیلؑ اور ان کی ماں ہاجرہؓ کی نسبت سے بعض جزئیات اور اجمال وتفصیل کے فرق کے علاوہ ان کے اور کتاب مقدس کے مذکورہ بیانات میں کوئی جوہری اور بنیادی فرق نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور تو اور اس بیان میں ابرام کے ساتھ خدا کا فرشتہ بھی حضرت سارہ کا ہم زبان ہو جاتا ہے۔ ترجمان القرآن فراہیؒ اپنے معرکۃ الآرا رسالے 'الرائ الصحیح فیمن ہوالذبیح' میں تورات کے حوالہ سے ان دونوں واقعات کی تردید ایک ساتھ کرتے ہیں:

'یہود نے صرف اسی پر بس نہیں کیا کہ حضرت اسماعیل کو اس شرف عظیم[۱] سے محروم کر دینا چاہا بلکہ تورات میں یہ بھی لکھ دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ان کی ماں کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا اور یہ کہ ان کی ماں حضرت ہاجرہ حضرت اسحاقؑ کی والدہ حضرت سارہ کی لونڈی تھیں۔ اس جھوٹ اور اس توہین کا وبال اگرچہ یہود کے سر پر آیا اور ان کو مصر کی غلامی اور ذلت ومسکنت کی ایک طویل آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن آباد واجداد کا گھمنڈ اس طرح ان کی گھٹی میں پڑا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بار بار کی تنبیہ کے باوجود یہ ان کے اندر سے نہ نکل سکا[۲] اسی رسالے میں آگے دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

'تیسرا عظیم الشان وہ فتنہ ہے جو انھوں نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کے اخراج سے متعلق گڑھا کہ چونکہ حضرت سارہؓ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ سے نفرت کرتی تھیں، ان کی خواہش یہ تھی کہ حضرت اسماعیلؑ حضرت اسحاقؑ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ

---

[۱] شرف عظیم یعنی حضرت اسحاقؑ کے بجائے سیدنا اسماعیل کا ذبیح ہونا۔

[۲] اردو ترجمہ 'الرائ الصحیح' از مولانا امین احسن اصلاحی، 'ذبیح کون ہے' /۱۱۸۔ دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ۔ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی۔ طبع اول۔ اس موقع پر یہود کی غلامی کی بابت علامہ نے اپنی تفسیر سورۂ فیل کا حوالہ دیا ہے۔ مولانا اصلاحی کے ترجمہ تفسیر سورہ فیل میں اس کی تفصیل ص۳۳۔۳۴ پر ہے۔ اسی موقع پر سیدنا اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہؓ کے متعلق یہود کی مذکورہ تحریفات کا حوالہ بھی ہے۔ تفسیر سورۂ فیل تالیف استاذ امام مولانا حمیدالدین فراہیؒ =

کی وراثت میں شریک نہ ہوں، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو فاران کے بیابان کی طرف نکال دیا۔ حالانکہ یہ واقعہ جس صورت میں ان کے صحیفوں میں بیان ہوا ہے، اس میں اس قدر کھلا ہوا تضاد موجود ہے کہ ہر صاحب نظر اس کو بالکل لغو قصہ خیال کرنے پر مجبور ہے اور اس زمانہ میں تو خود ان کے اپنے اندر کے بہت سے ناقدین نے اس کی لغویت کا اعتراف کر لیا ہے[1]

اس سلسلے میں جہاں تک صحیح بخاری کی حضرت ہاجرہؓ کی حضرت سارہ کی خدمت گزاری والی روایت ہے، اس میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ تورات کی طرح بخاری کی اس روایت میں بھی سیدنا ابراہیمؑ کے مقابلے میں بھی حضرت سارہؓ کی شخصیت ابھری ہوئی ہے۔ فرعون مصر یا ملک جبار حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ حضرت سارہ کی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے اور ان سے اس کی عقیدت مندی اس انتہا کو پہنچتی ہے کہ کہاں تو وہ ان کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا اور کہاں دوسری روایت کے مطابق ان کی خدمت گزاری کے لیے اپنی بیٹی کو ان کے حوالہ کر دیتا ہے[2] جبکہ ایک اور روایت کے مطابق حضرت سارہؓ کی کرامت کو دیکھ کر شاہ مصر یہ تک کہہ دیتا ہے کہ میری بیٹی کا اس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ بن کر رہنے سے بہتر ہے[3]۔ علامہ العصر سید سلیمان ندویؒ اسی روایت کے حوالہ سے صحیح بخاری کی حدیث مذکور کو نبھانے کی خاطر اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ بڑی بیوی ہونے کی حیثیت سے حضرت ہاجرہؓ حضرت سارہؓ کی خدمت گزار تھیں[4] اس کے ساتھ ہی وہ بخاری کی حدیث بالا کا حوالہ دیتے ہیں اور یہ خود ہماری حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے[5]۔ سوال یہ ہے کہ چھوٹی بیوی بڑی بیوی کی خدمت گزار ہو قرآن اور شریعت الٰہی سے اس

= ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی ص ۳۲، ۳۳۔ دائرۂ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ۔ مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی، طبع دوم۔

[1] ذبیح کون ہے / ۱۳۷۔ محولہ بالا۔

[2] مولانا محمد حفظ الرحمان سیوہاروی م ۱۳۸۲ھ: قصص القرآن: ۱/۲۱۲۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔ طبع جدید عکسی، بار ہفتم ۱۹۸۶ء

[3] مولانا سید سلیمان ندوی م ۱۳۷۳ھ: ارض القرآن: ۲/۴۱۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۶ء

[4] حوالہ سابق

[5] حوالہ مذکور ۲۰۵

کے حق میں کیا دلیل اور بنیاد ہو سکتی ہے؟ اس کا عقل عام کے خلاف ہونا اس پر مستزاد ہے۔ آدمی کا جھکاؤ فطری طور پر بالخصوص عمر رسیدہ بیوی کے مقابلے میں نئی نویلی اور نوخیز بیوی کی طرف ہوتا ہے اور جبکہ نئی بیوی صاحب عزت و وجاہت اور بادشاہ زادی ہو تو اس صورت میں اس کے جھکاؤ کا مزید بڑھ جانا عین قرین قیاس ہے۔ خود سوکنوں کی آپسی غیرت و رقابت اپنے آپ میں ایک مسلمہ ہے جس سے ازواج مطہراتؓ اور امہات المومنینؓ کا استثناء نہ تھا[1]۔ ایسی صورت میں ایک جلیل القدر پیغمبر کا اس ظلم کی سرپرستی کرنا کہ اس کی چھوٹی بیوی بڑی بیوی کی خدمت گزار ہو، یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ قرآن نے تو ایک خاص دعوتی مصلحت کے پیش نظر سیدنا اسماعیل اور ان کی والدہؑ کے فضائل و مناقب اور ان کے شرف اور علو نسبی کے بیان سے گریز کیا[2]۔ اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر یہود ان کے پیچھے پڑے اور اس وقت تک انھیں چین نہ آیا جب کہ، جیسا کہ تورات کا حوالہ گزرا، انھوں نے حضرت ہاجرہؑ کو باقاعدہ حضرت سارہ کی باندی نہ بنا دیا اور بات اس قدر آگے بڑھی کہ ہمارے بزرگوں کو دفاعی پوزیشن میں آکر حضرت ہاجرہ کی آزادی کے دلائل کو زور و قوت

---

[1] حدیث و سیرت کی کتابوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ نمونہ کے لیے پیالے کے ٹوٹنے والی روایت اور سورۂ تحریم کی ابتدائی آیات کے شان نزول کی روایات کو پیش نگاہ رکھا جا سکتا ہے۔

[2] وہ دعوتی مصلحت یہ کہ یہود جو بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اپنے آباء و اجداد کے گھمنڈ کے مرض میں بری طرح گرفتار تھے اور اپنے اس جذبے کی تسکین کی خاطر انھوں نے حضرت ہاجرہؑ اور بنی اسماعیلؑ کی توہین میں بے سر و پا روایات کا اپنے ہاں انبار لگا رکھا تھا، اس فضا میں اگر قرآن حضرت ہاجرہ اور بنی اسماعیل کی علو نسبی کی بحث چھیڑ دیتا تو یہود اپنی من گھڑت روایات کے بھرے ترکش کے ساتھ میدان میں آجاتے اور بحث کا ایسا نہ منقطع ہونے والا سلسلہ چل پڑتا جس سے اسلام اور قرآن کی اصل دعوت کا معاملہ پردۂ خفا میں چلا جاتا۔ یہی مصلحت تھی جس کے پیش نظر قرآن نے حضرت سارہ کا ذکر تو بار بار کیا، لیکن ہاجرہ کے ذکر خیر سے یکسر گریز کیا، ذبیح کون ہے/ ۱۲۲، ۱۲۳۔ اردو ترجمہ الرائ الصحیح فیمن ہو الذبیح، از مولانا امین احسن اصلاحی، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، طبع اول (بدون سنہ) ترجمان القرآن فراہیؒ کا یہ عظیم تفسیری نکتہ ہے جس سے فہم قرآن کی بہت سی مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ یہی دعوتی مصلحت تھی جس کی رعایت سے سیدنا اسمٰعیلؑ کے ذبیح ہونے کی صراحت سے بھی کتاب اللہ نے احتراز کیا؛ ذبیح کون ہے/ ۱۱۳، ۱۱۴، محولہ بالا۔

کے ساتھ پیش کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا[1] سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ہاجرہؑ حضرت سارہؑ کی خادمہ اور دوسرے لفظوں میں ان کی باندی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صحیح حدیث کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے کہ:۔

انا سید ولد آدم	میں روز قیامت تمام اولاد آدم کا سردار
یوم القیامۃ ولا فخر[2]	ہوں گا اور یہ حقیقت ہے اس میں
	فخر و مباہات کی کوئی بات نہیں۔

دوسری روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سرداری اور عالی نسبی کی مزید صراحت ہے صحیح مسلم میں ہے:

ان اللہ اصطفی من ولد ابراہیم	اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیمؑ سے
اسماعیل، واصطفی من بنی اسماعیل	حضرت اسماعیلؑ کو چنا اور بنی اسماعیلؑ سے
بنی کنانۃ، واصطفی من بنی کنانۃ	بنی کنانہ کو چنا اور بنی کنانہ سے قریش کو چنا
قریشا، واصطفی من قریش بنی	اور قریش سے بنی ہاشم کو چنا اور مجھ کو بنی ہاشم
ہاشم، واصطفانی من بنی ہاشم[3]	سے چنیدہ قرار دیا۔

اس مضمون کی روایات بکثرت ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم ایک دو روایات کا مزید ذکر کرتے ہیں۔ حاکم اور بیہقی کی روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک طویل روایت کا آخری ٹکڑا ہے۔

ان اللہ خلق السموات	اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو سات
سبعا فاختار العلیاء منہا	طبق میں پیدا کیا۔ تو ان میں سے اس نے

---

[1] اشارہ ہے مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کے رسالے 'النصوص الباہرۃ فی حریۃ ہاجرہ' کی طرف جس کا حوالہ مولانا سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے قصص القرآن میں دیا ہے۔ ارض: ۲/۴۰ قصص: ۱/۲۱۳۔ البتہ قصص القرآن میں اس کا نام 'النصوص' کے بجائے 'البراہین الباہرۃ' الخ اسی طرح مصنف کا نام بجائے عنایت رسول کے 'غلام رسول' لکھا ہے: قصص القرآن، حوالہ سابق۔ افسوس کہ علی گڑھ میں ہم کو یہ رسالہ دستیاب نہ ہو سکا جس سے رسالے اور مصنف کے نام کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

[2] السیرۃ النبویہ لابن کثیر الدمشقی م ۷۷۴ھ: ۲/۱۹۲- دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۲ء تحقیق: مصطفیٰ عبدالواحد، [3] حوالہ سابق: ۲/۱۹۱

فاسکنها من شاء من	سب سے اوپری کا انتخاب کیا تو اس
خلقه، ثم خلق الخلق	میں اس نے اپنی مخلوقات میں ان لوگوں
فاختار من الخلق بنی آدم	کو جگہ دی جنھیں کہ اس نے چاہا، پھر اس
واختار من بنی آدم العرب،	نے اپنی مخلوقات پیدا کیں تو ان مخلوقات
واختار من العرب مضر،	میں سے اس نے بنی آدم کا انتخاب کیا،
واختار من مضر قریشا،	اور بنی آدم میں سے اہل عرب کا انتخاب
واختار من قریش بنی هاشم،	کیا اور اہل عرب سے مضر کا انتخاب
واختارنی من بنی هاشم،	کیا اور مضر سے قریش کا انتخاب کیا اور
فانا خیار من خیار [1]	قریش سے بنی ہاشم کا انتخاب کیا اور
	بنی ہاشم میں سے اس نے میرا انتخاب
	کیا۔ تو میں تمام چیزوں میں چنیدہ تر ہوں۔

حاکم اور بیہقی کی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے جس میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم صاف لفظوں میں فرماتے ہیں کہ:۔

'قال لی جبریل: قلبت	'مجھ سے جبرئیل نے صاف کہا: میں
الارض من مشارقها ومغاربها	نے روئے زمین کو مشرق سے مغرب
فلم اجد رجلا افضل	تک پلٹ کر دیکھ لیا تو مجھ کو محمدؐ سے
من محمد، وقلبت الارض	بڑھ کر کوئی دوسرا شخص نہ ملا۔ اور میں
مشارقها ومغاربها	نے روئے زمین کو مشرق سے مغرب
فلم اجد بنی اب افضل	تک پلٹ کر دیکھ لیا تو میں نے کسی خانوادے
من بنی هاشم [2]	کو بنی ہاشم سے بڑھ کر نہیں پایا۔

ترجمان القرآن فراہی صحیح بخاری کی مذکورہ روایت کے حوالہ کے بغیر سیدنا ابراہیم کی خدمت میں پیش کیے جانے کا تذکرہ کرتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ انھیں حضرت ہاجرہؑ کی جناب سارہؓ کی خدمت گزاری منظور نہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ

---

[1] حوالۂ مذکور: ۲/۱۹۳، ۱۹۴

[2] حوالہ سابق: ۲/۱۹۴۔

بابل سے روانگی کے بعد جب حضرت ابراہیم نے کنعان میں قیام کیا تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہاں انھیں بھیڑ بکریوں اور نوکروں چاکروں کی بڑی افزائش ہوئی اور وہ ایک دولت مند رئیس بن گئے۔ یہیں ایک میدان میں اس نواح کے ایک عرب سردار ابوملک نے آپ کو اپنا حلیفہ بنایا اور حضرت ہاجرہؓ کو آپ کی خدمت میں حوالہ کیا۔[۱] صحیح بخاری کا استناد اپنی جگہ مسلم اور روایات کی جانچ پرکھ اور ان کے راویوں کے عدل و ثقاہت کا اس کے یہاں اپنے آپ میں تسلیم لیکن اوپر کی تفصیلات کی روشنی میں دل چاہتا ہے کہ شاذونادر مقامات میں کسی راوی کے سہو و نسیان اور اس کی نادانستہ غلط فہمی و غلط نظری کے امکان کو اس کے اندر تسلیم کیا جائے۔ بہرحال ایسی ہی کسی غلط فہمی اور سہو کے پیش نظر حضرت فراہی کی پیروی میں ہمیں بھی حضرت ہاجرہ کی جناب سارہ کی خدمت گزاری اور چاکری منظور نہیں۔

۲۔ سیدنا اسماعیلؑ کی شیرخواری والی صحیح بخاری کی دوسری روایت کا معاملہ بوجوہ اس سے بھی زیادہ اپنے ساتھ پیچیدگیاں اور دشواریاں لیے ہوئے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں حضرت سارہ کے مومنہ ہونے کی صراحت نہیں لیکن مختلف مقامات پر ان کا تذکرہ اس نے جس انداز سے کیا ہے، خاص طور پر فرشتوں سے ان کی جو ہم کلامی کا تذکرہ سورۂ ہود اور سورۂ ذاریات[۲] میں ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صرف مومنہ ہی نہیں بلکہ انتہائی نیک و صالح اور اپنے شوہر کی وفاشعار اور فرماں بردار خاتون تھیں۔ یہ تسلیم کہ سوکنوں میں باہمی غیرت اور چشمک فطری ہے اسی نسبت سے حضرت ہاجرہؓ کے ان سے پہلے صاحب اولاد ہو جانے کی صورت میں اس غیرت و رقابت کا کچھ مزید بڑھ جانا بھی مستبعد نہیں، لیکن اس غیرت و رقابت کا علانیہ دشمنی اور عداوت میں تبدیل ہو جانا اس طور پر کہ انھیں اپنی سوکن کی صورت کا دیکھنا بھی گوارہ نہ ہو اور اسے ملک بدر کیے بغیر انھیں کسی صورت چین نہ آئے، شقاوت قلبی اس درجہ بڑھے کہ سوکن

---

[۱] ترجمان القرآن فراہی کا انقلابی رسالہ 'آنحضرتؐ کا سلسلۂ نسب اور اہل کتاب' ۱۲/۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، بار اول ۱۹۹۱ء، باہتمام مولانا محمد فاروق خاں مترجم ہندی قرآن۔ علامہ کا یہ رسالہ اپنی ذات میں خود ریسرچ و تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہے۔

[۲] ہود: ۷۱، ذاریات: ۲۹۔

کے ساتھ اس کے معصوم شیر خوار بچے پر بھی کچھ رحم نہ آئے، یہاں تک کہ جاتے وقت انھیں سیدھے سے جانے بھی نہ دیں اور انھیں مارتے پیٹتے بھاگنے کے لیے مجبور کریں بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی سوکن کی عضو بریدگی کی قسم کھالیں، اپنی ہی ایک بیوی اور وہ بھی صاحب حیثیت نئی بیوی کو ان مظالم کا نشانہ بنتے دیکھنے کے باوجود، محض اس کے تماشائی بنے رہنے سے سیدنا ابراہیمؑ کی جو کردارکشی ہوتی ہے وہ اپنی جگہ حضرت سارہ کی اس سے جو عزت افزائی ہو رہی ہے یقیناً اس سے صرف یہود کو ہی خوشی ہو سکتی ہے۔ جنھوں نے بعض دیگر مشرک اقوام کی طرح اپنے انبیاء اور بزرگوں کی کردارکشی اور ان کی بے عزتی و رسوائی کو اپنا ایک مستقل وظیفہ قرار دیا ہے، تورات کے مذکورہ بیانات میں اس صحیفے کی جو روایتی بے شرمی اور بے حجابی ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ بہر حال روایت کے اس پہلو سے قطع نظر سیدنا ابراہیمؑ کا اپنے چہیتے اور اکلوتے صاحبزادے اسماعیلؑ کو مکہ کی سرزمین میں اپنی ماں کے ساتھ یکہ و تنہا چھوڑ کر چلے آنا، سیدنا ابراہیم کی 'حلیم واواہ' کی صفات سے مغایر اور عقل عام کے خلاف ہونے کے ساتھ سورہ صافات کی آیت کریمہ کے الفاظ:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ (آیت: ۱۰۲)	تو جب اسماعیلؑ اپنے باپ کے ساتھ رہتے ہوئے دوڑنے کی عمر کو پہنچ گئے۔

سے اس کا صریح ٹکراؤ ہے۔ سیدنا اسماعیلؑ کی اپنے والد گرامی کی معیت میں پرورش کنعان یا بئر سبع میں ہوئی ہو[۱] یا ان کے کسی قدر سیانے ہو جانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ انھیں مکہ میں لائے ہوں اور ان کے ساتھ رہائش اختیار کر لی ہو، ان میں جو بھی صورت ہو، آیت کریمہ کے الفاظ 'فلما بلغ معه السعی' سے ہم کو اصرار ہے[۲] کہ دوڑنے کی اس عمر تک حضرت اسماعیل اپنے والد گرامیؑ کی معیت میں رہے اور شیر خوارگی کی عمر تک ان

---

[۱] بئر سبع اور کنعان کی تعیین و تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'آنحضرتؐ کا سلسلۂ نسب اور اہل کتاب'، محولہ بالا۔ مسکن ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی مزید تفصیل کے لیے ذبیح کون ہے ۳۴/ - ۳۸۔ نیز: ۱۲۲ - ۱۲۴۔ محولہ بالا۔

[۲] اپنی شاہکار ارض القرآن میں علامۃ العصر سید سلیمان ندوی بھی 'فلما بلغ مع السعی' سے اسی استدلال کے قائل ہیں۔ ارض: ۲/۳۴۳ - افسوس کہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ قصص القرآن میں اس نکتے کی صحیح قدرشناسی نہ کر سکے اور قرآن کے بالمقابل روایت کی اپنی ترجیح کے روایتی موقف کی تائید میں لگے رہے۔ قصص: ۱/۲۴۰-۲۴۲ محولہ بالا۔

کی پرورش و پرداخت ان کے والد ماجد کی آغوش اور ان کی معیت اور ان کی نگرانی میں ہوئی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے روایتی انداز میں صحیح بخاری کی پہلی روایت کی طرح اس دوسری روایت کو بھی بڑی حد تک نبھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہاں اس کے بڑھے ہوئے درایتی سقم کے پیش نظر یہ کہنے کے لیے مجبور ہو گئے ہیں کہ یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اسرائیلیات سے ہے[1]۔

کہاں سیرت اسماعیلؑ کی یہ روایتی بے جانی اور کہاں قرآن کا یہ بیان کہ سرزمین مکہ وہ دوسری بیوی کے بھگانے سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم اور اس کی ہدایت کے مطابق ایک خاص مقصد اور ایک خاص مشن بیت اللہ کی آباد کاری کے لیے انھیں اس سرزمین میں جا بسنے کا حکم ہوا:

۱۔ ربّنا انّی اسکنت	بارالہا! میں نے اپنی اولاد کو ایک
من ذریتی بواد غیر ذی	بے آب و گیاہ وادی میں تیرے قابل
زرع عند بیتک المحرم	احترام گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ بارالہا!
ربنا لیقیموا الصلوٰۃ	تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ تو تو ایسا کردے
فاجعل افئدۃ من	کہ لوگوں کے دل ان کی طرف جھک جائیں
الناس تھوی الیھم	اور تو ان کے لیے پھلوں سے روزی
وارزقھم من الثمرات	کا سامان کر جس سے کہ وہ تیرے شکر گزار
لعلھم یشکرون ٥ ربنا	ہوں۔ بارالہا! تو اچھی طرح جانتا ہے
انک تعلم ما نخفی	جو کچھ ہمارے دلوں میں ہے اور جو کچھ
وما نعلن وما یخفی علی	ہماری زبان پر ہے۔ اور اللہ سے زمین
اللہ من شیئ فی الارض	اور آسمان میں کون چیز چھپی رہ سکتی ہے

---

[1] ارض القرآن: ۲/۲۴۲۔ اس موقع پر علامہ کا اس روایت کا غیر مرفوع کہنا اگر ان کی اپنی رائے ہو تو الگ ہے ورنہ بخاری میں اس سے پہلے کی حدیث کے ذیل میں ایک عدم رفع کا جو تذکرہ ہے اس کی توجیہ اس سے مختلف ہے۔ یہ اس ضمن کے ایک واقع کے جزئیے کا اختلاف ہے۔ سیدنا اسماعیلؑ کی شیر خوارگی کا واقعہ اس سے متاثر نہ ہو کر اپنی جگہ جوں کا توں برقرار رہتا ہے (تفصیل کے لیے: فتح الباری: ۶/۲۵۰، ۲۵۱۔

ولا فی السمآء ۝ الحمد للّٰه	تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے
الذی وھب لی علی الکبر	جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیلؑ
اسماعیل واسحاق ط[۱] ان ربی	واسحاقؑ جیسی اولاد عطا کی سچ ہے کہ
لسمیع الدعاء ۝ رب	میرا رب دعا کا بڑا سننے والا ہے۔ اے
اجعلنی مقیم الصلوٰۃ	میرے آقا! مجھ کو نماز قائم کرنے والا بنا
ومن ذریتی قلے ربنا وتقبل	ساتھ ہی میری اولاد کو بھی ایسا ہی بنا دے
دعاء ۝ ربنا اغفرلی ولوالدی	بارالٰہا! اور میری اس دعا کو شرف قبول
وللمؤمنین یوم یقوم	عطا فرما۔ بارالٰہا! مجھے بخش دے ساتھ
الحساب ۝	ہی میرے ماں باپ اور تمام اہلِ ایمان
(ابراہیم: ۳۷-۴۱)	کو اس دن جس دن کہ محشر بپا ہوگا۔
۲۔ واذ یرفع ابراھیم	وہ بھی کیا وقت تھا جبکہ ابراہیمؑ
القواعد من البیت	کعبہ کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے اور
واسمٰعیل ط ربنا تقبل	اسماعیلؑ اس کام میں ان کے مددگار
منا انک انت السمیع	تھے اور ان کی زبانوں پر یہ دعا جاری
العلیم ربنا واجعلنا	تھی کہ بارالٰہا! تو ہماری اس محنت
مسلمین لک ومن	کو قبول فرمالے۔ بیشک تو ہی سب
ذریتنا امۃ مسلمۃ	سے بڑھ کر سننے اور جاننے والا ہے۔
لک ص وارنا مناسکنا	بارالٰہا! اور ہمیں تو اپنا تابع فرمان
وتب علینا ج انک انت	بنا دے اور ہماری عبادت کی جگہیں
التواب الرحیم ۝ ربنا	دکھا دے اور ہم پر اپنی عنایت کی نظر
وابعث فیھم رسولا	کر۔ بیشک تو ہی سب سے بڑھ کر عنایت
منھم یتلوا علیھم	کی نظر کرنے والا اور سب سے بڑا مہربان

---

[۱] اس دعا کے موقع پر سیدنا ابراہیمؑ کے بڑھاپے کے ساتھ اس کی بھی صراحت ہے کہ اس وقت تک سیدنا اسماعیلؑ کے ساتھ حضرت اسحاقؑ بھی پیدا ہو چکے تھے جیسا کہ علامۃ العصر سید سلیمان ندوی نے بھی اس سے یہی سمجھا ہے۔ (ارض القرآن: ۲/۴۲)

ءايٰتك ويعلمهم الكتٰب
والحكمة ويزكيهم انك
انت العزيز الحكيم ۝

(البقرہ: ١٢٧ - ١٢٩)

ہے۔ یا رالہا! اور تو ان کے درمیان سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کے روبرو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کے تزکیہ کا سامان کرے۔ بیشک تو بڑی طاقت والا اور حکمت والا ہے۔

٣۔ واذ بوانا لابراهيم
مكان البيت ان لا تشرك
بي شيئا وطهر بيتي للطآئفين
والقآئمين والركع
السجود واذن في الناس
بالحج ياتوك رجالا وعلى
كل ضامر ياتين من كل فج
عميق ۝ ليشهدوا منافع
لهم ويذكروا اسم الله
في ايام معلومٰت على
ما رزقهم من بهيمة
الانعام ج فكلوا منها
واطعموا البائس الفقير
ثم ليقضوا تفثهم
وليوفوا نذورهم
وليطوفوا بالبيت العتيق ۝
ذٰلك ق ومن يعظم
حرمٰت الله فهو خير
له عند ربه ط واحلت

وہ بھی کیا وقت تھا جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے کعبہ کی جگہ کی نشاندہی کی۔ اس تاکید کے ساتھ کہ تو میرے ساتھ کسی اور کو ساجھی نہ ٹھہرانا اور میرے گھر کو پاک صاف رکھنا طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے اور لوگوں کے درمیان حج کا اعلان کرو تو وہ تمہارے یہاں پیدل چل کر آئیں گے۔ ساتھ ہی ایسی سواریوں پر جو طویل مسافت سے دبلی ہو رہی اور کثرت استعمال سے ان کے راستے کشادگی کے ساتھ گھرے ہو رہے ہوں گے۔ یہ اس لیے تاکہ لوگ اپنے لیے (ہمہ جہتی) فوائد کے حصول کا سامان کریں اور اللہ تعالیٰ کے نام کو (قربانی کے) متعین دنوں میں ان جانوروں پر جو (اس مقصد سے) اللہ نے انھیں عطا کیے ہیں، پڑھیں۔ تو تم اس سے کھاؤ، ساتھ ہی (اس سے) محتاج فقیر کو کھلاؤ۔ پھر وہ اپنے میل کچیل صاف کریں

لکم الانعام الا ما یتلی
علیکم فاجتنبوا
الرجس من الاوثان
واجتنبوا قول الزور
حنفآء لله غیر مشرکین
به ومن یشرک بالله
فکانما خر من
السماء فتخطفه الطیر
او تهوی به الریح
فی مکان سحیق ۝
ذلک ق ومن یعظم
شعآئر الله فانها من
تقوی القلوب ۝ لکم
فیها منافع الی اجل
مسمی ثم محلها
الی البیت العتیق ۝

(حج: ۲۶-۳۳)

اور اپنی نذروں کو پوری کریں اور اس قدیمی گھر کا طواف کریں۔ یہ تو رہی ایک بات اور جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی حرمتوں کی تعظیم کرے تو یہ چیز اس کے رب کے نزدیک اس لیے بڑی بھلائی کا باعث ہے۔ اور تمہارے لیے جانوروں کو حلال ٹھہرایا گیا ہے سوائے ان کے جنھیں تمہیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو تم بتوں کی گندگی سے بچو ساتھ جھوٹ بولنے سے بچو۔ اللہ کے لیے بالکل یکسو ہوتے ہوئے اس کے ساتھ کسی اور کو ساجھی نہ ٹھہراتے ہوئے اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور کو ساجھی ٹھہرائے تو اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کہ وہ آسمان سے گرے تو اسے چڑیا اچک لے یا باد تند اسے تباہی کے گڑھے میں گرا دے۔ یہ ایک بات ہے اور جو کوئی اللہ کے ٹھہرائے ہوئے شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کی علامت ہے۔ تمہارے لیے ان میں نوع بہ نوع فائدوں کا سامان ہے۔ بعدازاں (قربانی کے) ان (جانوروں) کا پہنچ جانا ہے قدیمی گھر کے پاس۔

سیدنا اسماعیلؑ کی مکہ میں شیر خوارگی میں آمد کی روایت زیر بحث میں ان جائے قیام کی بے آب و گیاہی اور ویرانگی کا نقشہ بھی کچھ مبالغہ پر مبنی محسوس ہوتا ہے کتاب اللہ میں سیدنا ابراہیمؑ کی طرف سے اپنی ذریت اسماعیلؑ اور ان کی ماں کو بے آب و گیاہ سرزمین 'وادی غیر ذی زرع' میں لا بسانے کا جو تذکرہ ہے[1] اس میں ا

[1] ابراہیم: ۳۷

سرزمین کی بے آب وگیاہی حضرت ابراہیم کے سابقہ تینوں مسکنوں بابل اور کنعان و فلسطین کے بالمقابل معلوم ہوتی ہے، نہ یہ کہ یہ کوئی ویرانہ تھا جہاں دور دور تک کسی آدم اور آدم زاد کا پتہ نہ تھا۔ مکہ کو قرآن ہی نے دوسرے موقع پر تمام بستیوں کی ماں 'ام القریٰ'[1] کہا ہے جس کی معروف ترین تفسیر ہے کہ وہ ابتدائے آفرینش سے انسانی آبادی کا مرکز بلکہ اس کا منشا اور منبع رہا ہے[2] یہ بات کہ سیدنا اسماعیل کی اس آبادکاری یا اس کے علاوہ تاریخ کے کسی دوسرے مرحلے میں یہ سرزمین اور وہ بھی خانہ کعبہ بیت اللہ الحرام کا قرب و جوار انسانی آبادی سے بالکل خالی ہوگیا ہو، اس کے لیے کتاب اللہ کے بیان 'وادی غیر ذی زرع' کے علاوہ دوسرے ثبوت کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ یہ سرزمین ایسی ہی ویران اور انسانی آبادی سے بالکل خالی تھی تو قرآن کے ان بیانات کہ 'فاجعل افئدۃ من الناس تہوی الیہم' اور 'ربنا لیقیموا الصلوٰۃ' جن کا تذکرہ آیات بالا میں گزرا، ان کا کیا موقع محل ہے اور ان کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے؟

ترجمان القرآن فراہیؒ کے مسلک حدیث کی اپنی اس گفتگو کو ہم دور قریب میں اپنی جامعیت میں بے نظیر علامۃ العصر سید سلیمان ندوی کے اس تاثر پر ختم کرتے ہیں جس کا انھوں نے ترجمان القرآن کی وفات کے موقع پر اظہار کیا تھا کہ 'آہ! علم کا مزہ جاتا رہا'[3]۔ تعمق اور گہرائی ترجمان القرآن فراہیؒ کا دوسرا نام ہے۔ جس کے لاجواب نمونے ادب عربی اور تاریخ قرآن کے ان کے اختصاص کے موضوعات میں جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ترجمان القرآن کے اعزاز کے لیے اس قدر کافی ہے کہ وہ اس دورِ آخر میں رجوع الی القرآن کی تحریک کے داعی اوّل کی حیثیت سے سامنے آئے جنھوں نے اس میدان میں عنفوان شباب سے کتاب اللہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اپنی مثالی محنت اور ریاض سے علوم القرآن کی ایک نئی دنیا آباد کی اور نت نئے انکشافات کا ایک جوئے بار رواں کیا۔ گرفت دیکھنی ہو تو علمِ تفسیر میں آدمی مولانا فراہیؒ کی گرفتوں کو دیکھے

---

[1] انعام: ۹۲ [2] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے ہمارے مضمون 'ابتدائے تاریخ کا تصور اور قرآن'، مطبوعہ ششماہی علوم القرآن علی گڑھ جولائی۔ ستمبر ۱۹۹۱ء میں بحث 'دنیا کا پہلا مرکز'۔

[3] مولانا عبدالماجد دریابادی م ۱۹۷۷ء: مکتوبات سلیمانی: ۱/ ۲۷۲۔ صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ ۱۹۶۷ء۔

ریسرچ وتحقیق کی حقیقت سے آشنا ہونا چاہے تو اپنے اختصاص کے دائرے میں آپ کی تحقیقات عالیہ کو پیش نگاہ رکھے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی بابت حضرت امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ دنیا بھر کے لوگ فقہ میں آپ پر عیال ہیں[1] آپ پر ہزار تنقید کی جائے فقاہت اور تفقہ میں آپ کی مرجعیت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں، فرق مراتب اور ہر شخص کو اس کا جائز حق دینے کے اصول کی رعایت سے کسی درجہ میں تفسیر کے میدان میں ایسا ہی کچھ ترجمان القرآن فراہیؒ کی نسبت کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب اللہ کی روشنی میں احادیث وآثار کی تحقیق اور کتاب الٰہی سے ان کے استناد واستنباط کے سلسلے میں بھی ترجمان القرآن نے اپنے پیچھے جو نا تمام ذخیرہ چھوڑا ہے، اس کے کچھ نکات اور کچھ دفعات سے اختلاف کے باوجود بہت سے پہلوؤں سے اس میدان میں بھی ان کے افکار وآرا کی گہرائی اور گیرائی قابل دید ہے۔ سلف میں علامہ ابن تیمیہؒ م ۷۲۸ھ سے بڑھ کر احادیث وآثار کا دلدادہ ملنا مشکل ہے۔ ذخیرہ حدیث میں صحیح بخاری ومسلم کی اہمیت وعظمت کے سلسلے میں وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہم زبان ہیں جس کا حوالہ اس سے پہلے گزرا۔ اس کے باوجود بعض پہلوؤں سے وہ صحیحین کی احادیث کو نقد ونظر سے بالا نہیں سمجھتے[2] ماضی قریب کے ہمارے بعض چوٹی کے علماء کا معاملہ اس سے مختلف نہیں جو اس نقد ونظر میں درایت کے ساتھ روایت کے پہلو کو خارج از امکان قرار نہیں دیتے[3] درجے اور تفصیلات کے فرق سے دستیاب ذخیرۂ حدیث کے سلسلے میں اسی طرح کی رائے ترجمان القرآن فراہی کی بھی ہو تو بعض دائروں میں اختلاف کے باوجود جس کے نمونے پچھلے صفحات میں سامنے آئے، فہم حدیث کے سلسلے میں ان کے پیش کردہ دیگر نکات اور نتائج افکار سے مثبت طور پر بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا جاسکتا اور انھیں آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ خالص ریسرچ وتحقیق سے آگے اس کی دینی اہمیت وافادیت میں بھی کلام نہیں ہوسکتا۔

---

[1] مقدمۃ عمدۃ الرعایہ فی حل شرح الوقایہ مع شرح الوقایہ للعلامۃ اللکھنوی: ۱/۷، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۲۷ھ بحوالہ الکفوی فی طبقات الحنفیۃ، والکفوی ہو محمود بن سلیمان الکفوی نسبۃ الی کفۃ بلدۃ من بلاد الروم المتوفی سنہ ۹۹۰ھ۔

[2] فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۱۸/۱۷-۲۱ محولہ بالا۔

[3] صحیح بخاری کے سلسلے میں حضرت قاسم العلوم والخیرات بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی رائے بروایت مرحوم مولانا سعید اکبرآبادیؒ براہ راست۔ (نوٹ: حضرت فراہیؒ کے مسلک حدیث کے سلسلے میں ناچیز راقم السطور کے خیالات کی نمائندگی تحقیقات کے اسی بہتر شدہ مضمون سے ہوتی ہے۔ اس خصوص میں آئندہ اسی کا حوالہ دیا جائیگے۔ (س)

سیر و سوانح

کیا البیرونی سندھی تھے؟

پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں

ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی (وفات ۔ ۴۴۲/۱۰۵۰) دنیا کے ایک بڑے عالم اور سائنسداں تھے ۔ اُن کی جائے پیدائش کے متعلق کافی اختلافات ہیں[1] عرصہ دراز سے اس موضوع پر کافی لکھا جاتا رہا ہے ۔ اس کے متعلق مختلف مسلمان مورخین و علماء وادباء کی رایوں کو فرمان فتحپوری نے اپنے ایک مضمون میں جمع کر دیا ہے شمس الدین محمد بن محمود شہر زوری، ابن ابی اصیبعۃ، ابن حوقل، ابوالفداء اور حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ البیرونی البیرون میں پیدا ہوئے تھے جو سندھ کا ایک شہر ہے ۔ اس لحاظ سے البیرونی سندھی ہیں اور ہندوستانی بھی ۔ موجودہ دور کے ایک فرانسیسی مورخ ایم ۔ ریناد نے بھی لکھا ہے کہ البیرونی کی جائے پیدائش "بیرون" (سندھ کا ایک شہر) ہے ۔

فرمان فتحپوری کا قول ہے کہ قاہرہ کی معجم المطبوعات اور مولوی عبدالحئی کی نزھتہ الخواطر میں ہے کہ البیرونی بیرون سے منسوب ہے جو سندھ کا ایک شہر ہے بعض مورخین اور علماء نے تحریر کیا ہے کہ اس شہر کا نام اصل میں بیرون نہیں ہے بلکہ نیرون ہے جو سندھ میں موجودہ حیدر آباد کے قریب ایک شہر تھا ۔ یہ لفظ بیرون ہو یا نیرون اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ہے ۔ اصل سوال یہ ہے کہ وہ البیرونی کیوں کہلاتے ہیں

---

[1] ۲۶ رنومبر ۱۹۷۳ء سے ۱۲ ردسمبر ۱۹۷۳ء تک ایک بین الاقوامی سمینار البیرونی پر پاکستان کے شہر کراچی اور اسلام آباد میں منعقد ہوا تھا جس میں ساری دنیا کے علماء ودانشوروں نے حصہ لیا تھا ۔ اس کا اہتمام حکیم سعید صاحب نے "ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن" پاکستان کے تحت کیا تھا ۔ اس میں جو مقالات پڑھے گئے وہ ۱۹۷۹ء میں تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحات میں کراچی سے شائع ہوئے تھے ۔ اس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا ایک مقالہ "ابوریحان محمد بن احمد البیرونی کی جائے پیدائش کا قضیہ" کے عنوان سے شامل تھا (صفحات ۸۲۷ - ۸۳۷)

اور کیا اُن کی جائے پیدائش البیرون یا النیرون ہے؟

مشہور مورخ ابن الاثیر، القلقشندی اور ایک مشہور جغرافیہ داں ابن سعید نے بھی اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے کہ البیرونی کا تعلق البیرون سے ہے جو دیبل اور منصورہ کے درمیان ایک شہر تھا۔

فرمان فتحپوری نے اس رائے کو مسترد کر دیا ہے کہ البیرونی کا بیرون یا نیرون یا سندھ سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف ان کی رائے نہیں ہے بلکہ ازمنہ وسطیٰ کے بعض دوسرے علماء و مورخین نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ منجملہ اور علماء کے عبدالکریم سمعانی، یاقوت الحموی نے بھی لکھا ہے کہ وہ البیرونی اس لیے کہلاتے تھے کہ وہ خوارزم میں بس گئے تھے لیکن وہ بیرون خوارزم سے آئے تھے اور اس ملک کے باشندے خوارزم سے باہر کے آئے ہوئے لوگوں کو البیرونی کہتے ہیں۔ اس رائے کو موجودہ دور کے دوسرے علماء نے بھی قبول کر لیا ہے۔ مثلاً سید حسن برنی، علی اکبر دہ خدا، ڈاکٹر ایڈورڈ سخاؤ، مولانا عبدالسلام ندوی، نیاز فتحپوری، اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ اردو کے مولفین۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ البیرونی کے نام اور ان کی جائے پیدائش کے متعلق علماء کے دو گروہ ہیں پہلے گروہ میں ازمنہ وسطیٰ کے بیشتر علماء ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ البیرونی کی نسبت سندھی شہر البیرون سے ہے اور وہی اُن کی جائے پیدائش ہے۔ دوسرے گروہ میں چند علماء ہیں جن کا خیال ہے کہ البیرونی خوارزم کے باہر کسی مقام میں پیدا ہوئے تھے اور اسی لیے وہ البیرونی کہلاتے تھے۔ ڈاکٹر ڈی۔ جے۔ بواو نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ البیرونی الخوارزم کے دارالسلطنت کتھ کے باہر کسی مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے البیرونی کہلاتے تھے۔ (دیکھئے، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ جدید ایڈیشن، جلد اول (۱۹۶۰ء ص ۱۲۳۶)

موجودہ دور کے کئی اکابر علماء نے دوسرے گروہ کی رائے کو تسلیم کر لیا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پہلا گروہ اپنی رائے کے حق میں ثبوت پیش کرتا ہے جبکہ دوسرے گروہ کے پاس کوئی خاص ثبوت نہیں ہے۔ وہ یہ واضح طور پر بتا نہیں سکتے کہ اگر البیرونی کی جائے پیدائش سندھ کا شہر البیرون نہیں ہے تو پھر کون سا شہر ہے؟ صرف یہ لکھ دینا کہ وہ خوارزم سے باہر کسی شہر میں پیدا ہوئے تھے ایک غیر یقینی سی بات

ہے۔ پروفیسر محمد صغیر حسن معصومی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ البیرونی نے خود تحریر کیا ہے کہ وہ ۳ ذی الحجہ ۳۶۲ھ کو خوارزم میں پیدا ہوئے تھے لیکن اس کا کوئی ثبوت یا ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ (دیکھئے ان کا مقالہ بعنوان Al-Biruni's Creeds as Depicted in his works کراچی کے بین الاقوامی سمینار کی روداد جس کی تفصیل صفحۂ اول کے حاشیے پر درج ہے، ص۳۸۸) اس کے علاوہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ سندھ کے شہر البیرون میں پیدا ہوئے تھے اس کے بعد وہ خوارزم چلے آئے اور کہیں نہیں گئے اسی لیے ان کو البیرونی کہا جاتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ البیرونی کو الخوارزم سے غیر معمولی محبت تھی۔ وہ یہاں کی خوارزمی زبان بھی جانتے تھے اور انھوں نے خوارزم کی ایک تاریخ بھی لکھی تھی جس کا نام "کتاب المسامرۃ فی اخبار خوارزم" تھا۔ افسوس کہ وہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ وہ ۳۹۹/۱۰۰۸ء میں خوارزم کے سلطان ابوالحسن علی بن مامون کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے اور کم از کم سات سال تک ان کی اور ان کے بھائی خوارزم شاہ ابوالعباس مامون بن مامون کی خدمت کرتے رہے۔

(۲)

ستمبر ۱۹۷۹ء میں مجھے اتاترک کلچر مرکزی کی دعوت پر ایک بین الاقوامی سمینار میں مقالہ پیش کرنے کے لیے انقرہ (ترکی) کا سفر کرنا پڑا۔ سمینار کے اختتام کے بعد میں نے استنبول کا سفر کیا اور ترکی کے مشہور کتب خانوں مثلاً سلیمانیہ لائبریری اور توپ کپی سرائے لائبریری وغیرہ میں چند مخطوطات کا مطالعہ کیا۔ توپ کپی سرائے لائبریری میں ایک مخطوطہ میری نظر سے گزرا جو البیرونی کی جائے پیدائش کے متعلق بہت اہم ہے اس کی اطلاع مجھے پروفیسر آئیدین سائیلی کی کتاب "بیرونی ارمغان" سے ملی تھی۔ اور میں نے اس مخطوطے کا خاص طور سے مطالعہ کیا۔ اس کے مصنف شیخ احمد بن علی زنبیل المحلّی المنجّم الرّمال ہیں۔ کتاب کا نام قانون الدنیا ہے اور اس کا نمبر رواں ۱۶۲۸ ہے۔ یہ مخطوطہ ۹۷۰ھ مطابق ۱۵۶۲ء میں لکھا گیا تھا۔ فہرست کا نمبر ۶۵۶۲ ہے۔ اس میں ۶۵ اوراق ہیں۔ ہر صفحے پر ۲۹ سطریں ہیں۔ اس میں مصوّری

کے نمونے ہیں۔ اس مخطوطے کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

کتاب قانون الدنیا وعجائبہا الشیخ احمد بن علی زنبیل المحلّی المنجم الرمال

اور اس کا خاتمہ یوں ہوتا ہے:۔

وکان الفراغ من ھٰذہ النسخۃ علی ید العبد الفقیر المعترف بالعجز والتقصیر الراجی عفو ربہ القدیر احمد بن علی بن المرحوم حسن السعودی غفر اللّٰہ لہ ولوالدیہ ولجمیع المسلمین فی یوم الاربعاء المبارک الثالث والعشرین من ذی القعد الحرام ستۃ سبعین وتسعمائتہ

اس مخطوطے میں مندرجہ ذیل نوٹ بھی ہے۔

الحمد للّٰہ علی التوفیق واستغفر اللّٰہ من کل تقصیر خادم الفقیر بشیر اغای دار السعادہ الشریفۃ

اس میں البیرونی کے حالاتِ زندگی بھی درج ہیں لکھا ہے۔

البیرونی ھو الاستاذ ابو الریحان محمد بن احمد البیرونی منسوب إلی بیرون وھو مدینہ فی السند، کان مشغولا بالعلوم الحکمیۃ فاضلاً فی علم الہیئۃ والنجوم ولہ نظر جید فی صناعۃ الطب۔

اوپر کی عبارت سے ایک اور ثبوت ملتا ہے کہ بیرونی کی جائے پیدائش ہندوستان میں سندھ کا ایک شہر "البیرون" تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس مخطوطہ کے مصنف نے پہلے گروہ کے علماء میں سے کسی ایک سے یہ قول نقل کیا ہو۔ اس طرح ایک اور مصنف کا اضافہ ہوا جو البیرونی کو سندھی سمجھتا تھا۔

بہرحال راقم السطور کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ کوئی ایسا ثبوت مل گیا ہے جس سے یہ یقینی طور پر کہا جا سکے کہ البیرونی سندھی تھے۔ لہٰذا ہندوستانی تھے۔ اس مختصر مقالے کا مقصد ایک اور مخطوطے کی طرف دنیا کے علماء اور محققین کی توجہ مبذول کرانا ہے کہ زمنہ وسطیٰ کا ایک اور مصنف بھی البیرونی کو سندھی اور ہندوستانی سمجھتا تھا۔

تعارف وتبصرہ

عربی کی بعض قدیم کتابوں کے جدید ایڈیشن

جناب عبدالمتین منیری

تحقیقاتِ اسلامی کے گذشتہ دو شماروں میں تعارف وتبصرہ کی گنجائش نہیں نکل سکی تھی۔ اب اس کی تلافی کچھ زیادہ صفحات کے ذریعہ کی جارہی ہے۔ یہ تمام تبصرے جناب عبدالمتین منیری صاحب کے قلم سے ہیں۔ قدیم کتابوں کے ذیل میں سب سے پہلے حدیث کا پھر صحابہ کرام کے فتاویٰ کا ذکر کیا جارہا ہے گو کہ ان کی ترتیب وتدوین جدید ہے۔

(جلال الدین)

۱۔ مجمع البحرین فی زوائد المعجمین (۱۰ جلدیں مع فہرست)

تالیف: الحافظ نورالدین الہیثمی   تحقیق: عبدالقدوس بن محمد نذیر۔

ناشر: مکتبہ الرشد۔ الریاض۔

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد اللخمی الطبرانی الشامی کا شمار خیر القرون کے ان ائمہ و محدثین میں ہوتا ہے جن کے احسان سے امتِ مسلمہ کا سر قیامت تک جھکا رہے گا۔ آپ کی پیدائش ۲۶۰ھ میں ہوئی اور وفات ۳۶۰ھ میں۔ آپ کی عمر کے ۸۷ سال طلب حدیث اور اس کی اشاعت میں صرف ہوئے۔ آپ نے مسلسل ۳۲ سال طلب حدیث میں شام، عراق، حجاز، یمن مصر وغیرہ ممالک چھان مارے۔ ان کی اسی جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ المعجم الکبیر، المعجم الاوسط، المعجم الصغیر، کتاب الدعاء وغیرہ کی شکل میں سند کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہزاروں احادیث مدون ہوئیں۔ کچھ عرصہ قبل تک حدیث نبوی کا یہ عظیم سرمایہ مخطوطات کی صورت میں دنیا بھر کے چند ایک کتب خانوں کی زینت بنا ہوا تھا اور ان سے استفادہ ناممکن تھا۔ لہٰذا طبرانی کی روایتیں بالواسطہ طور پر ہی مختلف مجموعوں میں زیادہ تر بغیر اسانید کے ملتی تھیں۔ اب کچھ عرصہ سے اصل کتابیں جدید تحقیقات کے ساتھ منظر عام پر آرہی ہیں۔

المعجم الکبیر صدیوں تک علماء کی دست رس سے دور رہنے کے بعد اب سے کچھ سال پیشتر شیخ حمدی عبدالمجید السلفی کی تحقیق کے ساتھ ۲۵ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ البتہ اس کے تین اجزاء ۱۳، ۱۶ اور ۲۱ کے قلمی نسخے محقق کو اب تک کسی کتب خانہ میں نہیں ملے۔

المعجم الاوسط گزشتہ چند سال سے ڈاکٹر محمود الطحان کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔ اس کے اب تک تین اجزاء منظر عام پر آ چکے ہیں۔ خدا کرے یہ سرمایہ جلد منظر عام پر آ جائے۔

المعجم الصغیر کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

چونکہ پہلے زمانے میں پریس کا وجود نہیں تھا اس لیے حدیث کی ضخیم کتابوں کو نقل کرنا اور عام علماء و طلبہ کا انھیں استعمال میں رکھنا ممکن نہیں تھا اور انقلابات زمانہ سے احادیث کے ان ذخائر کے ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے آٹھویں صدی کے حافظ حدیث و امام نورالدین الہیثمی ۷۳۵ھ / ۸۰۷ھ نے حدیث کی بڑی اور ضخیم کتابوں میں سے ان احادیث و روایات کو جمع کرنا شروع کیا جنھیں صحاح ستہ کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں نقل نہیں کیا ہے۔ یہ سلسلہ زوائد کے نام سے معروف ہے۔ ان میں وہ احادیث پائی جاتی ہیں جو کہ صحاح ستہ میں نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ معروف نہیں ہیں، اس طرح امام موصوف نے بہت سی احادیث کو زمانہ کی دستبرد سے بچا لیا۔ امام موصوف نے اس سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابیں ترتیب دیں۔

۱۔ غایۃ المقصد فی زوائد مسند احمد

مسند امام احمد کی وہ روایتیں جو صحاح ستہ میں موجود نہیں ہیں۔

۲۔ کشف الاستار عن مسند البزار

مسند بزار کی وہ روایتیں جو صحاح ستہ میں موجود نہیں ہیں۔

۳۔ المقصد العلی فی زوائد ابی یعلی الموصلی۔

مسند ابی یعلی کی وہ روایتیں جو صحاح ستہ میں موجود نہیں۔

۴۔ البدر المنیر فی زوائد المعجم الکبیر۔

المعجم الکبیر للطبرانی کی وہ روایتیں جو صحاح ستہ میں موجود نہیں۔

۵۔ موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان

صحیح ابن حبان کی وہ روایتیں جو صحیح بخاری و مسلم میں موجود نہیں۔

۶۔ بغیۃ الباحث عن زوائد مسند الحارث

مسند الحارث کی وہ روایتیں جو صحاح ستہ میں موجود نہیں۔

۷۔ مجمع البحرین فی زوائد المعجمین۔

زیر تبصرہ کتاب۔

۸۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد

مسند احمد، مسند البزار، مسند ابی یعلی، معاجم طبرانی کی ان روایات کا مجموعہ جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں۔ مصنف نے ان روایات کی سندیں حذف کر دی ہیں البتہ حدیث کی حیثیت واضح کر دی ہے کہ وہ صحیح ہے یا حسن، ضعیف ہے یا موضوع۔ ان کتابوں میں سے کشف الاستار چار جلدوں میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تحقیق سے شائع ہو چکی ہے اور اصل کتاب مسند البزار کی چار جلدیں ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن سلفی کی تحقیق کے ساتھ منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اندازہ ہے کہ پوری کتاب ۱۶ سے بھی زیادہ جلدوں میں آئے گی۔

موارد الظمآن کی بعض جلدیں شیخ عبدالرحمٰن حمزہ کی تحقیق کے ساتھ اور بعض جلدیں شیخ حسین اسد کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ اصل کتاب صحیح ابن حبان کو ۱۶ جلدوں میں شیخ شعیب ارناوط نے ایڈٹ کیا ہے۔ یہ بھی شائع ہو چکی ہے۔

مجمع الزوائد کافی عرصہ قبل حسام القدسی کی محنت سے دس جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن یہ نسخہ بہت سقیم اور غلطیوں سے پر تھا۔ اب دار الفکر کا نیا تحقیق شدہ نسخہ جدید طباعت کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ شیخ حسین اسد کے تحقیق کردہ نسخہ کی ابتدائی تین جلدیں بھی آئی ہیں۔

مجمع الزوائد اب تک وہ واحد کتاب تھی جس کے ذریعہ طبرانی، مسند ابی یعلی اور مسند بزار کی احادیث تک رسائی ممکن تھی۔ لیکن اس میں اسانید کی غیر موجودگی کی وجہ سے حدیث کی صحت وضعف کے سلسلہ میں مصنف پر مکمل اعتماد کرنا پڑتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب دو دہائیوں سے اصل کتابیں پورے اہتمام اور تحقیق کے ساتھ منظر عام پر آ رہی ہیں۔

امام نور الدین ہیثمی کے امت پر احسانات میں سے ایک احسان زیر تبصرہ کتاب ''مجمع البحرین'' بھی ہے اس میں آپ نے امام طبرانی کی المعجم الاوسط اور المعجم الصغیر کی ان روایات کو جمع کر دیا ہے جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں۔ یہ قیمتی کتاب شیخ عبدالقدوس

بن محمد نذیر کی کاوشوں اور جدوجہد سے پہلی مرتبہ منظرعام پر آئی ہے۔ اس کی اہمیت اس پہلو سے بھی ہے کہ تادم تحریر المعجم الاوسط مکمل شائع نہیں ہوئی ہے لہٰذا یہی زوائد اس عظیم الشان مجموعہ کی جگہ لے گی جس کے بارے میں امام طبرانی نے خود فرمایا ہے کہ یہ میری روح ہے۔

اس کتاب کی تحقیق کے دوران محقق نے دو مخطوطے سامنے رکھے ہیں اور ان کے ذریعہ نصوص کا موازنہ وتصحیح کی ہے۔ کتاب کی جملہ احادیث کی تخریج بڑی محنت سے کی گئی ہے اور رجال حدیث کے سلسلے میں محققین کی آراء کو جانفشانی سے جمع کیا گیا ہے، طباعت معیاری ہے۔ کتاب کی تمام احادیث کا حروف تہجی کے لحاظ سے انڈکس مستقل جلد کی صورت میں شائع ہوا ہے اس نے کتاب میں موجود احادیث کی تلاش میں کافی سہولت پیدا کر دی ہے۔

(۲) موسوعۃ فقہ زید بن ثابتؓ وابی ھریرۃؓ

تالیف : ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی

ناشر : دار النفائس بیروت، لبنان

اسلامی فقہ سے استفادہ کو آسان بنانے کے لیے عرصہ سے ایک جامع انسائیکلوپیڈیا کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے جس میں فقہی مسائل واصطلاحات وفقہاء وائمہ کے اختلافات کو مستند ذرائع سے بیان کیا گیا ہو۔ اس مقصد کے تحت کئی سرکاری اداروں نے کمیٹیاں بنائیں، کام کا آغاز ہوا لیکن اس طویل اور صبر آزما کام کا سلسلہ برابر ٹوٹتا رہا اور پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ مصر میں جمال عبدالناصر کے دور حکمرانی میں موسوعۃ جمال عبدالناصر فی الفقہ الاسلامی، کے نام سے ایک عظیم انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب الازہر یونیورسٹی کی اسلامک ریسرچ اکادمی نے شروع کی تھی لیکن ۲۰ جلدوں میں حرف الف ہی تک یہ کام رک گیا۔ اسی طرح شام اور کویت کی حکومتوں نے بھی اس کام کا آغاز کیا، امید ہے کہ کویت کی وزارۃ الاوقاف فقہ اسلامی پر مکمل انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اس کام کی طوالت اور مسلسل رکاوٹوں کو دیکھتے ہوئے فقہ اسلامی کی عظیم کتابوں تفسیر قرطبی، المغنی لابن قدامہ، المحلی لابن حزم، الام للشافعی، رد المحتار للشامی کی فہرستوں کو معاجم کے انداز میں ترتیب دیا گیا تاکہ اس دور میں جب کہ وقت کی قلت کے باعث

ان ضخیم کتابوں سے استفادہ کرنا مشکل ہو رہا ہے ان فہرستوں کے ذریعہ چند لمحات میں مطلوبہ مسائل ان کتابوں میں تلاش کیے جاسکیں۔ اس تعلق سے شیخ محمد وہبہ الزحیلی کی کتاب الفقہ الاسلامی وادلتہ اور محمد المنتصر الکتانی کی کتاب معجم فقہ السلف قابل ذکر ہیں۔

اس سلسلے کا اہم کام ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے انجام دیا ہے۔ آپ وزارۃ الاوقاف کویت کے اسلامی فقہ کی انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب وتدوین میں ابتداءً شریک رہے لیکن جب آپ نے محسوس کیا کہ حکومتیں بدلنے، بجٹ کے کم ہونے، لکھنے والوں کی تبدیلی کے باعث یہ کام مکمل نہیں ہو پاتا تو آپ نے مشہور فقہاء صحابہ وفقہاء سلف جن کا مستقل مذہب تدوین نہیں پاسکا، ان کے فتاویٰ وفقہی مسائل کی ترتیب وتدوین کا کام حروف تہجی کی ترتیب سے شروع کر دیا۔ اب تک اس سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) موسوعۃ فقہ ابی بکر الصدیقؓ (۲) موسوعۃ فقہ عمرؓ بن الخطاب (۳) موسوعۃ فقہ عثمانؓ ابن عفان (۴) موسوعۃ فقہ علیؓ بن ابی طالب (۵) موسوعۃ فقہ عبداللہ بن مسعودؓ (۶) موسوعۃ فقہ عبداللہ بن عمرؓ (۷) موسوعۃ فقہ ابراہیم النخعی (۸) موسوعۃ فقہ الحسن البصری (۹) موسوعۃ فقہ سفیان الثوری

اس سلسلے کی مزید کتابیں موسوعۃ فقہ عبداللہ بن عباسؓ، موسوعۃ فقہ محمد بن جریر الطبری، موسوعۃ فقہ الامام ابن تیمیہ زیر طبع ہیں۔

آپ کے بعض شاگردوں نے بھی اس سلسلے میں کام شروع کیا ہے، اور موسوعۃ فقہ عائشہ ام المومنین کے نام سے شیخ سعید فائز الدخیل کی، اور موسوعۃ فقہ جابر بن زید کے نام سے ایک اور کتاب شائع ہوئی ہے۔

اس طرح مصنف کا خیال ہے کہ جب فرداً فرداً فقہاء صحابہؓ ائمہ اسلاف کے فقہی مسائل ترتیب وار کتابی شکل میں آجائیں تو آئندہ کسی ادارہ یا فرد کو انھیں یکجا کر کے مکمل فقہی انسائیکلوپیڈیا کی شکل دینا آسان ہوگا۔

زیر تبصرہ کتاب بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں مولف نے کتب حدیث و فقہ میں حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف منسوب فتاویٰ اور مسائل کو معاجم کے انداز میں مرتب کیا ہے اور ان دو اجزاء کو علیحدہ علیحدہ کتابوں میں شائع کرنے کے بجائے ایک جلد میں شائع کیا گیا ہے۔

ہر جز کے شروع میں بطور مقدمہ ان جلیل القدر صحابہ کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً حضرت زید بن ثابتؓ سے متعلق موسوعہ میں آپ کے حالات زندگی، اسلام، ذکاوت، نکتہ سنجی، جہاد، علم وتفقہ، رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین سے تعلقات وروابط پر تحقیقی بحث کی گئی ہے اور پھر الف بائی ترتیب کے ساتھ فقہی مسائل کو مع حوالہ جات بیان کیا گیا ہے۔

یہی طریقہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعلق موسوعہ سے ہے۔

ڈاکٹر رواس قلعہ جی کے اس سلسلے نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے دینی مسائل کے سننے والوں، نبوی مزاج شناسوں، ذات نبوی سے براہ راست دین سمجھنے والوں کے علم وتفقہ کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کردیا ہے اور اس سے استفادہ کو آسان بنادیا ہے۔ اس پر مصنف امتِ مسلمہ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

(۳) الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف

مؤلف : امام ابوبکر بن ابراہیم بن المنذر النیشاپوری

تحقیق : ڈاکٹر ابوحماد صغیر احمد بن محمد حنیف ناشر : دار طیبہ، ریاض (سعودی عرب)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ۱۴ سو سال گزر رہے ہیں، اس دوران میں مسلمانوں میں کئی فتنے اٹھے، بیسیوں فرقوں نے جنم لیا۔ دین کی تشریح عجیب عجیب انداز سے کی گئی۔ باوجود اس کے خدا کا دین محفوظ ہے۔ امت مسلمہ کے سواد اعظم نے دین کی نئی تشریحات کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت اور رہنمائی تھی کہ آپ کے دور سے لے کر تین ادوار یا تین صدیاں امت کا بہترین زمانہ ہے۔ لہٰذا امت اسلامیہ نے اپنا یہ اصول بنادیا کہ دین کی وہی تشریح قابل قبول ہوگی جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہو۔ اگر کسی مسئلہ کے تعلق سے آپ کا قول نہ ملے تو آپ کی صحبت پانے والے صحابہ کے اقوال تلاش کیے جائیں، اگر وہاں بھی مطلوبہ مسئلہ نہ ملے تو پھر تابعین اور تبع تابعین کی اقوال وارشادات میں جوابات طلب کیے جائیں۔ ائمہ اربعہ اور محدثین عظام امام بخاری، مسلم، وغیرہ کا دور بھی ان تین صدیوں کے درمیان آتا ہے۔

ائمہ سابقین نے قرون ثلاثہ میں پائے جانے والے صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے مسائل کو جمع کرنے کا خصوصی اہتمام کیا۔ قدیم مجموعوں میں مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق اور آخری ادوار میں المجموع شرح المہذب للامام النووی اور المحلی لابن حزم بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی امام ابوبکر محمد بن ابراہیم ابن المنذرؒ کی کتاب الاوسط ہے۔ جو پہلی مرتبہ زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے۔

امام ابن المنذر کی پیدائش ۲۴۲ھ اور وفات ۳۱۸ھ میں ہوئی، یعنی امام بخاری کے انتقال کے وقت آپ کی عمر تقریباً ۱۴ سال تھی۔ آپ کی تصنیفات کا اہم موضوع مسائل دینیہ میں خیر القرون میں گزرے ہوئے فقہا، وائمہ کے فتاویٰ جمع کرنا ہے۔ اب سے پہلے آپ کی ایک کتاب الاجماع منظر عام پر آ چکی ہے۔ جس میں آپ نے اپنے علم کے مطابق خیر القرون میں متفق علیہ مسائل جمع کیے ہیں۔

اور اب مختلف قلمی نسخوں سے موازنہ کے بعد ڈاکٹر ابو حماد صغیر احمد صاحب کی جہد و کاوش سے آپ کی کتاب "الاوسط" منظر عام پر پہلی مرتبہ آ رہی ہے اور اب تک اس کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں امید ہے کہ یہی تسلسل جاری رہا تو پندرہ سے زیادہ جلدوں میں یہ کتاب مکمل ہو گی۔ کیونکہ پانچویں جلد پر صرف کتاب الصلاۃ کے ابواب ختم ہوئے ہیں۔

امام ابن المنذرؒ کی کتابیں ائمہ اسلاف کا ہمیشہ مرجع رہی ہیں۔ امام نووی نے اپنی عظیم الشان کتاب المجموع میں اختلافی مسائل میں امام موصوف کی کتاب "الاشراف فی اختلاف العلماء" سے استفادہ کیا ہے جو کہ الاوسط کا خلاصہ ہے اور لکھا ہے کہ دوسرے فقہاء کے مقابلہ میں مسالک کے نقل کرنے میں امام موصوف زیادہ قابل اعتبار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام نووی کو الاوسط نہیں ملی۔ ورنہ وہ اسی کو شاید مرجع بناتے۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ مستقل اسانید کے ساتھ فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان اسانید کی قدر و قیمت وہی بہتر جان سکتا ہے جس کو علم حدیث سے انس ہو۔

ڈاکٹر صغیر احمد اور ناشر دار طیبہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کے طفیل میں موجودہ نسل کے ہاتھوں ایک ایسا علمی گہر آ گیا ہے جس کو دیکھنے کے لیے ہمارے اگلے بزرگوں کی آنکھیں صدیوں سے ترس رہی تھیں۔

ہمیں امید رکھنی چاہئیے کہ اس قسم کی کتابوں کی اشاعت سے ہمارا ائمہ اسلاف سے تعلق مضبوط ہوگا اور ارشاد نبوی کے مطابق ہمارے مسائل و مشکلات کے حل کے لیے ہماری نگاہیں خیر القرون کی طرف اٹھیں گی۔

کتاب کا معیار طباعت اور تحقیق بلند ہے۔

(۴) صحیح کتاب الاذکار وضعیفہ

تصنیف: امام ابوزکریا محی الدین یحیی نووی ، تحقیق: ابواسامہ سلیم بن عبدالہلالی

ناشر: مکتبۃ الغرباء الاثریہ، مدینہ منورہ (۲ جلدیں)

امام نوویؒ کا شمار ساتویں صدی کے ان مصنفین میں ہوتا ہے۔ جن کی کتابوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت بخشی۔ فقہ شافعی کے امام و فقیہ ہونے کے باوجود بلالحاظ مسلک تمام مسلمانوں نے ان کی کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ان سے استفادہ کیا اور پیش آنے والے مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کی۔ یوں تو آپ کی المجموع شرح المہذب، المنہاج شرح مسلم، روضۃ الطالبین، تحریر الفاظ التنبیہ دینی مسائل میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کی تصنیف ریاض الصالحین اور 'الاذکار' کا شمار مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے اور شاید ہی کوئی مکتبہ ایسا ہو جو ان سے خالی ہو۔

الاذکار کو امام صاحب نے ہر مسلمان کے لیے گائڈ بک بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شب و روز میں کی جانے والی دعاؤں اور اذکار کو اس طرح جمع کیا ہے کہ اس میں غلط باتیں نہ آنے پائیں۔ اس کتاب سے بیشتر لکھی جانے والی کتابیں عموماً رطب و یابس سے بھری ہوتی تھیں، کیونکہ اس دور کی تصنیف کا طریقہ یہ تھا کہ احادیث و روایات کو اسانید کے ساتھ نقل کر دیا جاتا اور اس کی تحقیق کا کام قاری پر چھوڑ دیا جاتا تاکہ وہ علم رجال کی مدد سے ان کی صحت یا ضعف کا پتہ لگائے۔ اس کتاب سے پہلے لکھی جانے والی کتابیں الدعاء للطبرانی، الدعوات الکبیر للبیہقی اسی قسم کی ہیں۔ جب مسلمانوں میں سہولت پسندی کا رواج عام ہونے لگا اور مسلم علماء کی توجہ علم رجال و تحقیق حدیث سے ہٹ کر منطق، کلام اور فلسفہ کی طرف ہونے لگی تو پھر بغیر اسانید کی کتب حدیث کا سلسلہ چل نکلا۔ جب امام صاحب نے محسوس کیا کہ اسانید کے بغیر ترتیب دی گئی کتابوں کی وجہ سے لوگ من گھڑت دعاؤں اور

اذکار کے عادی ہو رہے ہیں، اور جو دعائیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط منسوب ہیں انھیں بھی صحیح سمجھ کر اختیار کیا جا رہا ہے تو پھر امام نووی نے صحیح اذکار و دعاؤں کا یہ مجموعہ ترتیب دیا۔ اس میں بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور نسائی میں موجود اذکار و دعاؤں کو جمع کیا۔ امام نووی نے اس کتاب میں صحیح روایات ہی کو جمع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض ضعیف روایات بھی اس کتاب میں داخل ہو گئی ہیں۔ چونکہ دعاؤں اور اذکار کا تعلق براہِ راست انسان کی عبادت سے ہے اور ان میں اثر کی فراوانی اسی وقت ممکن ہے جبکہ یہ دعائیں اور اذکار حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت سے صادر ہوئی ہوں آپ کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کو دہرانے میں جو برکت اور اثر ہے کسی بھی انسان کے بتائے ہوئے کلمات میں وہ تاثیر نہیں ہو سکتی۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کتاب کی افادیت اور اس کے اثر کو مزید بڑھایا جائے اور محدثین کے معیارات کے مطابق اس کی روایتوں کی تخریج و تحقیق ہو تاکہ اطمینان کے ساتھ لوگوں کو بتایا جا سکے کہ یہ کلمات حضور پر نور کی زبانِ مبارک سے نکلے تھے۔

خدا کا شکر ہے شیخ ابو اسامہ سلیم الہلالی نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اور دو جلدوں میں اس کتاب کا نیا ایڈیشن تحقیق مزید کے بعد شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں موجود ہر حدیث کے بعد اس کا حوالہ اور ان کی صحت یا ضعف کے تعلق سے ماہرین فنِ حدیث کی آراء بیان کی گئی ہیں۔ کتاب کی چھپائی بھی صاف اور معیاری ہے۔

اس سے پہلے الاذکار کے تین مختلف ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ابن علان کی کئی جلدوں میں اس کی شرح (الفتوحات الربانیۃ) اور ابھی قریب میں حافظ ابن حجر کے اس کتاب پر نوٹ (نتائج الافکار فی تخریج احادیث الاذکار) کی بھی دو جلدیں شیخ حمدی عبدالمجید السلفی کی تحقیق سے شائع ہو چکی ہیں۔ الاذکار کا زیر تبصرہ ایڈیشن چار قلمی نسخوں کو سامنے رکھ کر ایڈٹ کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اہل علم اس ایڈیشن کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

(۵) التوقیف علی مهمات التعارف۔ معجم لغویٌّ مصطلحٌ

تالیف: شیخ محمد عبدالرؤف المناوی، تحقیق: ڈاکٹر محمد رضوان الدایۃ
ناشر: دار الفکر المعاصر بیروت، دار الفکر دمشق۔

علم چاہے کوئی بھی ہو اسے سمجھنے کے لیے اس کی اصطلاحات کو سمجھنا ضروری ہے یہ اصطلاحات کلید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا جب کوئی طالب علم مطالعہ کی میز پر بیٹھتا ہے تو اسے ڈکشنریوں جیسی معاون کتابوں کو جہاں سامنے رکھنا ہوتا ہے وہاں وہ اصطلاحات کی جامع کتابوں کی بھی ہمیشہ ضرورت محسوس کرتا ہے۔

ہمارے علماء نے جہاں علمِ دین کی دوسری ضرورتوں کو پورا کیا ہے وہیں پر اصطلاحات کی جامع تصنیفات کی ترتیب و تدوین میں بھی محنت صرف کی ہے ان میں جو کتابیں اب تک زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں ان میں شریف جرجانی کی کتاب التعریفات سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یوں تو یہ ایک جامع کتاب ہے۔ لیکن چونکہ شریف جرجانی کی زیادہ تر شہرت ایک متکلم فلسفی اور منطقی کی ہے لہٰذا یہی رنگ اس کتاب پر بھی غالب ہے اور اس کی بہت سی تشریحات کو سمجھنے میں ایک عام طالب علم دقت محسوس کرتا ہے اس کے علاوہ جدید تحقیقی معیار پر اس کتاب کی اشاعت کا کام ہنوز باقی ہے۔ اسکے بعد امید ہے اس سے استفادہ آسان ہو جائیگا۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف شیخ محمد عبدالرؤف مناویؒ (۹۵۲ھ — ۱۰۳۱ھ) دسویں صدی ہجری کے آخر اور گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں گزرے ہیں۔ اس دور کے مورخ محبی نے اپنی کتاب خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر میں آپ کو اپنی صدی کا سب سے بڑا عالم شمار کیا ہے۔ آپ کی تصنیفات کا دائرہ تفسیر، فقہ، حدیث، منطق، تصوف، سیرت و تاریخ وغیرہ تمام دینی علوم پر حاوی ہے۔ آپ کی شائع شدہ کتابوں میں فیض القدیر شرح الجامع الصغیر حدیث کے موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

شیخ مناوی نے التوقیف کی تالیف کے وقت تعریفات جرجانی اور اس سے قبل کی کتابوں کو سامنے رکھا ہے اور ان کی خوبیوں کو اس کتاب میں سمو دیا ہے۔ کتاب اپنے سے بیشتر کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور واضح ہے۔ جگہ جگہ اصطلاحات کے ساتھ ساتھ اصل لغوی معنی بھی بیان کیے ہیں۔ اس کتاب میں اس دور میں استعمال ہونے والی تفسیر حدیث فقہ تاریخ تصوف فلسفہ منطق بلاغت عروض وغیرہ علوم فنون کی جملہ اصطلاحات اور ان کی تشریحات آگئی ہیں۔

محققِ کتاب ڈاکٹر محمد رضوان الدایۃ نے اس کتاب کو معنوی لحاظ سے بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، اور جدید تحقیقی معیار کو باقی رکھا ہے۔ مصنف نے جن اصطلاحات

کی تشریح کی ہے۔ دوسرے مآخذ اور مراجع سے انھیں ڈھونڈھ نکالا ہے اور ان کے حوالہ جات درج کیے ہیں۔ لہٰذا تفصیلی مطالعہ کے لیے بھی یہ کتاب معاون و مددگار ہے۔

کتاب کا طباعتی معیار لبنان کے روایتی معیار کے عین مطابق ہے امید ہے یہ کتاب علمی حلقوں میں مقبول ہوگی، اور طلبہ علوم شرعیہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے۔

آخر میں مسلمانوں کے ایک قدیم علم سے متعلق ایک جدید کتاب کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

الردود والتعقبات علی ما وقع للامام النووی فی شرح مسلم من التاویل فی الصفات

تصنیف : ابو عبیدہ مشہور بن حسن آل سلمان۔

ناشر : دار الہجرہ۔ مدینہ منورہ

خدائے تعالیٰ پر ایمان اکثر آسمانی مذاہب میں مشترک عقیدہ رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کے بارے میں سب کا عقیدہ ایک طرح کا ہے۔ کیونکہ خدا کی صفات کے تعلق سے ان مذاہب کا موقف ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسلام نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں جس قدر واضح موقف اختیار کیا ہے، کسی دوسرے مذہب میں اس کا وجود نہیں ہے، اسے اسلام کا امتیاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسلام نے صرف اللہ کی وحدانیت ہی پر ایمان کی تعلیم نہیں دی ہے بلکہ ان صفات الٰہیہ پر بھی عقل و شعور کے ساتھ ایمان لانے کی تاکید کی ہے جن کی تفصیلات قرآن و حدیث میں پھیلی ہوئی ہیں۔

خیر القرون میں جب تک عجمی افکار و خیالات کی یلغار شروع نہیں ہوئی تھی مسلمانوں نے تصنع اور تکلف سے پاک آسان اور صاف شفاف اسلام کو دلوں سے لگائے رکھا۔ لیکن جب یونانی فلسفہ اور غیر اسلامی افکار کا مسلم معاشرہ میں چلن شروع ہوا اور مسلم دانشوران سے متاثر ہونے لگے تو جہاں اسلام کے بہت سے گوشوں پر اس کی ضرب پڑی وہیں اسلامی عقیدہ بھی ان کی زد میں آگیا اور اس کا صاف شفاف منظر گرد آلود ہوگیا۔ اس

کی شکل وصورت مسخ ہوکر رہ گئی۔ معتزلہ، جہمیہ جیسے باطل فرقے اس عقیدہ کی بگڑی ہوئی شکل کے علمبردار بن گئے۔ چونکہ حکومت وقت میں ان کی دست رس بہت دور تک تھی لہٰذا ان غلط افکار وخیالات کا خوب چرچا ہونے لگا۔ اس وقت تک مسلمانوں کا مزاج بال کی کھال نکالنے کا نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا مسلم علماء ودانشوروں نے قرآن وسنت میں موجود اسلامی عقیدہ کو بغیر کسی تاویل وتوجیہ کے من وعن قبول کیا لیکن جب عجمی افکار کا فتنہ زیادہ بڑھا تو ائمہ ومحدثین نے قرآن واحادیث سے عقیدہ اسلامی کی تفصیلات یکجا کرنی شروع کیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے ذیل میں جو روایات سند کے ساتھ ملتیں ان کو مرتب کیا اس کے نتیجہ میں عقیدہ طحاویہ امام ابن بطہ کی الابانۃ، امام ابن خزیمہ کی الاسماء والصفات، امام ابن مندہ کی کتاب الایمان جیسی قیمتی کتابیں وجود میں آئیں۔

لیکن یونانی فلسفہ سے متاثر ذہنوں کو نقل کے بجائے عقل کا چسکا لگا تھا۔ اس وقت ایک ایسے عبقری کی ضرورت تھی جو انہی کے استدلالی طریقوں کو اپنا کر اُن کے ہتھیار کند کرے۔

اس وقت عقیدہ اسلامی کے دفاع کے لیے امام ابوالحسن اشعری میدان میں آئے چونکہ آپ کا تعلق بھی ابتدا میں یونانیت زدہ فلسفیوں اور عقل پرستوں سے تھا۔ لہٰذا جب آپ نے اصلاحی تحریک کا آغاز کیا تو باطل کو زیر کرنے کے لیے انہی وسائل کو اپنایا جنھیں ان کے مخالف اپنائے ہوئے تھے۔ اس کے نتیجہ میں انھیں مخالفین پر وقتی غلبہ تو حاصل ہوگیا لیکن سابقہ تربیت کے بعض مضر اثرات سے ان کی فکر آزاد نہ ہوسکی۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کی فکر کو امت میں بڑا زبردست اعتماد حاصل ہوا۔ اسے معیار قرار دے کر اس کا دفاع کیا جانے لگا اور ایک وہ وقت بھی آیا کہ آپ کے تفردات اور مسائل شاذہ ہی کو اہل سنت وجماعت کا شعار قرار دیا گیا تو علماء کے ایک طبقہ نے ہر طرح کے تعصب وتحزب سے بالا ہوکر صحیح اور صاف وشفاف اسلامی عقیدے کی نشر واشاعت اور عقائد باطلہ کی تردید کا زبردست فرض انجام دیا۔ ان علماء میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور

ان کے شاگرد رشید امام ابن القیم الجوزیہ کی شخصیتیں نمایاں حیثیت کی مالک ہیں۔ کتاب پر یہی فکر چھائی ہوئی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے عقیدہ سے متعلق ان مسائل کی نشاندھی کی ہے جن میں امام نووی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب شرح صحیح مسلم میں بہت سی جگہوں پر اسلاف سے ہٹ کر مسلک اختیار کیا ہے۔

مصنف کا لب ولہجہ مؤدبانہ اور شائستہ ہے۔ کتاب کے شروع ہی میں ایک مستقل باب میں جو صفحہ ۱۱ سے شروع ہوتا ہے امام نووی کی طرف سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) بہت سی لغزشیں امام نووی کی طرف اس لیے منسوب ہوں گی کہ آپ نے امام مازریؒ اور قاضی عیاضؒ کے مسلک کو نقل کرکے خاموشی اختیار کی ہے۔ (۲) امام نوویؒ کا شمار اسماء وصفات کے علماء محققین میں نہیں ہوتا بلکہ آپ کی اصل حیثیت ایک فقیہ کی ہے (۳) امام نووی اس لیے ان افکار سے متاثر ہوئے کہ آپ کا دور اشعری مکتب فکر کی اشاعت کا قریبی دور تھا۔

صفحہ ۳۰ پر مصنف نے امام نوویؒ اور آپ جیسے دوسرے ائمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"اشاعرہ میں بہت سے ایسے علماء ہوئے ہیں جنھوں نے شریعت کی عظیم خدمت کی ہے۔ جیسے دو حفاظ حدیث امام ابوبکر بیہقی اور امام ابوالقاسم ابن عساکر اور امام عز بن عبدالسلام و دیگر اشعری علماء و فضلاء۔ ہم انھیں ان کے اچھے کاموں سے یاد رکھیں گے اور جو تھوڑی بہت بدعات ان سے سرزد ہوئی ہیں ان کی طرف اشارہ بھی کریں گے۔ کیوں کہ حق کی راہ میں جذباتِ محبت کو آڑے نہیں آنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فقہ، تفسیر وحدیث وغیرہ علوم میں ان علماء نے جو خدمات انجام دی ہیں عقیدہ سے متعلق ان کے بعض نئے خیالات کی وجہ سے ان سے استفادہ نہ کیا جائے احتیاط کے ساتھ ان سے استفادہ ہم ضرور کریں گے۔

ہمارے اسلاف اور ائمہ حدیث نے تو بہت سے بدعتیوں سے بھی احادیث اور روایتیں نقل کی ہیں، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ راوی اپنی بدعات کے باوجود روایت حدیث میں سچے ہیں۔

ہم ان علماء کو کافر گمراہ اور فاسق قرار دینے سے پرہیز کریں گے۔ کیونکہ اسلاف کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ ان علماء سے اس معاملہ میں جو لغزشیں ہوئی ہیں وقت ضرورت ان کے تذکرہ اور تردید پر اکتفا کریں گے۔

ہمارا یہ رویہ ہر اس عالم کے ساتھ ہونا چاہئے جس پر بدعات اور ہوس کا غلبہ نہ ہوا ہو۔ اور ان کے بارے میں ہمیں معلوم ہو کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی آرزو رکھتے ہیں اور کتاب وسنت میں حق کی جستجو کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کسی شبہ کی وجہ سے کسی معاملہ میں غلطی کر بیٹھیں۔ (العقیدۃ السلفیہ فی کلام رب البریہ ۴۳۱)

کتاب کو ان ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) مقدمہ (۲) پہلا باب (۱) ظاہری مفہوم کو اپنانے بغیر تاویل کرنے کا حکم۔

(۲) قواعد وکلیات میں امام نوویؒ کا تعاقب۔

(۳) دوسرا باب: صفات الٰہیہ میں تاویل کا ابطال۔

(۴) تیسرا باب: اہم مسائل میں امام نوویؒ کا تعاقب۔

(۵) چوتھا باب: امام نوویؒ کا لوگوں کو بدعات سے روکنا اور امر بالمعروف ونہی المنکر کا فریضہ انجام دینا۔

فہرست سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مصنف کے ہاتھ سے انصاف کا دامن چھوٹنے نہیں پایا ہے اور امام نوویؒ کی زندگی کے روشن پہلوؤں کو بھی خوب اجاگر کیا ہے۔

مصنف نے کتاب کا اختتام امام ابو العباس احمد بن فرح الاشبیلیؒ کے اس جملہ پر کیا ہے۔ "شیخ محی الدین نوویؒ نے تین مراتب پائے، ان میں سے ہر ایک مرتبہ ایسا ہے کہ وہ کسی شخص میں پایا جائے تو دنیا بھر سے لوگ اپنے اونٹوں کے بازوان کی طرف سفر کے لیے کسیں۔

پہلا مرتبہ: علم دین اور اس کے لوازمات کو پورا کرنا۔

دوسرا مرتبہ: دنیا اور اس کی تمام انواع واقسام سے زہد اختیار کرنا۔

تیسرا مرتبہ: امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا۔

بحیثیت مجموعی کتاب علمی تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

ادارہ کی نئی تصنیف "صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات"

ادارہ کے کارکنان جن علمی موضوعات پر تحقیقی کام کرتے ہیں۔ ادارہ کی جانب سے ان کی نشر و اشاعت کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت متعدد وقیع کتابیں شائع ہو کر علمی حلقوں میں عام مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ابھی حال ہی میں وقت کے ایک اہم موضوع پر سکریٹری ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب "صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات" منظر عام پر آئی ہے۔ موجودہ دور میں مختلف تہذیبی و تمدنی اسباب کی بنا پر اس مسئلہ نے عالمی اہمیت اختیار کر لی ہے اور جدید طب نے اسے حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں صحت و توانائی کی اہمیت، طہارت و نظافت، غذا کے استعمال کھانے پینے کے آداب، کھیل کود، ورزش اور تفریحات کے موضوعات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں علاج و معالجہ کے بعض مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ علاج کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا لا علاج مریض خود یا اس کے اعزہ اس کی جان تلف کر سکتے ہیں؟ کیا بوقت ضرورت محرمات سے علاج کیا جا سکتا ہے؟ احکام شریعت میں مرض کی کہاں تک رعایت کی گئی ہے؟ مریض کے ساتھ ہمدردی اور عیادت کی کیا اہمیت ہے؟ یہ اور ان جیسے دیگر سوالوں کو مولانا نے کتاب و سنت کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض قدیم مسائل کو بھی جدید اسلوب میں پیش کیا ہے۔ صفحات ۳۸۸ عمدہ کاغذ، آفسیٹ کی حسین طباعت، جاذب نظر گیٹ اپ۔ مجلد مع ڈسٹ کور قیمت صرف ۷۰ روپئے۔ مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی دودھ پور علی گڑھ اور مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

۴ مئی ۱۹۹۴ء کو اسٹوڈینٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا کے صدر دفتر (ابوالفضل انکلیو نئی دہلی) میں مذکورہ کتاب کی تقریب رسم اجرا منعقد ہوئی۔ اس موقع پر مولانا محمد سراج الحسن چیرمین اشاعت اسلام ٹرسٹ، مولانا محمد فاروق خاں صدر ادارۂ تحقیق۔ جناب محمد شفیع مونس۔ جناب سید یوسف۔ جناب محمد جعفر۔ ایس آئی او کے ممبران اور دیگر حضرات موجود تھے۔ مولانا سراج الحسن صاحب نے رسم اجرا انجام دی۔ جناب سید یوسف صاحب نے تقریب کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مصنف نے کتاب کا مختصر اور جامع تعارف کرایا اس تقریب کی رپورٹ سہ روزہ دعوت نئی دہلی میں شائع ہوئی۔

اسی کتاب کی ایک تعارفی تقریب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی ہوئی۔ اس کا انعقاد آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں ۱۲ مئی ۱۹۹۴ء بعد مغرب ہوا جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اساتذہ نے کتاب پر اظہار خیال کیا اور اس کی افادیت اور اہمیت کا اعتراف کیا۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی (شعبۂ تاریخ) نے فرمایا کہ مولانا نے ہمیشہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ اس کتاب میں بھی آپ نے جن مباحث کو چھیڑا ہے وہ عام طور پر موضوع بحث نہیں بنتے۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی (اسلامک اسٹڈیز) نے فرمایا کہ مولانا کی شخصیت ہم سبھوں کے لیے تحریری و تصنیفی طور پر مہمیز کرنے کا باعث ہوئی ہے۔ مولانا کا اسلوب بہت سادہ اور رواں ہے۔ انھوں نے کتاب کے مباحث کا بھی تعارف کراتے ہوئے ان کی اہمیت اجاگر کی۔ میڈیکل کالج کے استاد اور مشہور ماہر امراض قلب پروفیسر محمد احمد نے فرمایا کہ اتنی اچھی کتاب دیکھ کر میرے دل میں خواہش ہوئی کہ کاش ایسی کتاب میں لکھتا۔ انھوں نے کتاب کے بعض نکات کی طبی اعتبار سے اہمیت بیان کی۔ صدر شعبۂ علم الادویہ طبیہ کالج پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن نے فرمایا کہ طب نبوی پر سر زمانے میں کام ہوا ہے مگر مولانا نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان پر اب تک کسی زبان میں بھی اتنی تفصیل سے اظہار خیال نہیں کیا گیا اور حوالوں اور تحقیق کے ساتھ ایسی بحث نہیں کی گئی ہے۔ حکیم مودود اشرف (طبیہ کالج) نے کتاب کے بعض گوشوں کی طرف توجہ دلائی۔ آخر میں مصنف کتاب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ آج اسلام

ہر سطح پر موضوع بحث ہے۔ روزانہ اس کے کسی نہ کسی پہلو کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اب یہ اس کے ماننے والے کا فرض ہے کہ اسے دنیا کے سامنے چیلنج بنا کر پیش کریں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ آج اسلامی نظام حیات کے ہر پہلو پر طویل تحقیقات کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کوششیں اجتماعی سطح پر ہوں تو ان سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔

پروفیسر فضل الرحمٰن فریدی نے اس تقریب کی صدارت کی۔ نظامت کے فرائض رکن ادارہ مولانا سلطان احمد اصلاحی نے انجام دیے۔ ادارہ کی مطبوعات کا اسٹال بھی لگایا گیا۔ اس تقریب کی رپورٹ ہندی روزنامہ امر اجالا ۱۵ مئی ۹۴ء اور سہ روزہ دعوت نئی دہلی ۲۸ مئی ۹۴ء میں شائع ہوئی۔

مذکورہ کتاب پر دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ ریڈینس کی ۲۹ مئی ـ ۴ جون ۹۴ء کی اشاعت میں رکن ادارہ ڈاکٹر منور حسین فلاحی کا تبصرہ شائع ہوا ہے۔ تبصرہ نگار نے کتاب کے مباحث کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے اسے وقت کے ایک اہم موضوع پر ایک اہم تصنیف قرار دیا ہے۔

سکریٹری ادارہ کا سفر دہلی و حیدر آباد

سکریٹری ادارہ جناب مولانا سید جلال الدین عمری گزشتہ مہینوں بعض مقامات کے دورے پر رہے جہاں انھیں مختلف پروگراموں میں اظہار خیال کا موقع ملا۔

اسٹوڈینٹس اسلامک آرگنائزیشن طلبہ اور نوجوانوں کی ایک دینی تنظیم ہے جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں طلبہ اور نوجوانوں کی علمی نشوونما اور اصلاح و تربیت کی خدمات انجام دیتی ہے۔ اس نے دہلی میں یکم تا ۵ مئی ۹۴ء اپنے منتخب ممبران کا ایک کیمپ لگایا جس میں مختلف دینی موضوعات پر اہل علم کے لیکچرس رکھے۔ اس میں سکریٹری ادارہ کی بھی شرکت رہی اور انھوں نے "توحید اور شرک کا فرق" اور "اصلاح و تربیت کیسے ہو" کے موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ نیز "ملکی پس منظر میں سیکولرزم اور جمہوریت" کے موضوع پر طلبہ کے ایک مذاکرہ کی نگرانی کی اور اس پر تبصرہ کیا۔

اسی قسم کا ایک تربیتی کیمپ حیدر آباد میں ۱۵ ـ ۲۰ مئی ۹۴ء ایس آئی او آندھرا پردیش زون کی جانب سے منعقد ہوا تھا۔ اس میں شرکت کرنے کے لیے

سکریٹری ادارہ نے حیدرآباد کا سفر کیا۔ جہاں ۱۹ مئی ۱۹۹۶ء تک ان کا قیام رہا۔ کیمپ میں انھوں نے مختلف اوقات میں جن موضوعات پر اظہار خیال کیا وہ یہ ہیں۔ قرآن مجید کے مشہور مفسرین اور اہم تفسیریں۔ قرآن فہمی کے بنیادی اصول، درس قرآن کی تیاری کیسے کی جائے؟ تاریخ تدوین حدیث، اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ۔ مذکورہ دونوں کیمپس کے شرکاء میں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ مولانا نے ان کی رعایت سے ان موضوعات پر اظہار خیال کیا اور ان کے سوالات کے جوابات دیے۔

حیدرآباد میں سکریٹری ادارہ کو معززین شہر کی ایک نشست سے بھی خطاب کا موقع ملا۔ اس میں انھوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اس وقت اسلام کو سماجی علوم کے میدان میں زبردستی چیلنج کا سامنا ہے۔ چاہے اس کا تعلق معاشیات سے ہو یا سیاسیات سے یا معاشرت سے یا نفسیات سے۔ آج کل حیدرآباد میں فتنۂ انکار حدیث زور پکڑ رہا ہے۔ سکریٹری ادارہ نے اس کے پس منظر میں بھی گفتگو کی اور بتایا کہ یہ دراصل مسلمانوں کو شریعت سے کاٹنے کی ایک سازش ہے۔

حیدرآباد میں سکریٹری ادارہ کو اپنے بعض رفیقوں کے ہاں شادیوں میں شرکت کا بھی موقع ملا۔ اس مناسبت سے انھوں نے نکاح کی غرض و غایت اور نکاح کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر اظہار خیال کیا۔

حیدرآباد ہی میں سکریٹری ادارہ کو خواتین کے ایک اجتماع سے بھی خطاب کا موقع ملا۔ انھوں نے مسلم خواتین کو دعوت فکر دی کہ آخر جو لوگ اسلام کے مخالف ہیں اور اسے تنقید کا نشانہ بنانے سے کبھی نہیں چوکتے وہ مسلم خواتین کے اتنے ہمدرد کیوں ہیں؟ پھر انھوں نے فرمایا کہ دراصل ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ اسلام سے بغاوت مسلمان گھروں سے شروع ہو جائے اور مسلمان عورت اپنے شوہر ماں باپ حتیٰ کہ اپنی اولاد سے باغی ہو جائے اس لیے کہ یہی وہ قلعہ ہے جہاں اسلام محفوظ رہ سکتا ہے۔ تقریر کے بعد خواتین کی طرف سے کیے گئے مختلف نوعیتوں کے بہت سے سوالات کا فاضل مقرر نے جواب دیا۔ تقریباً دو سو خواتین نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

اس سفر میں سکریٹری ادارہ کو دائرۃ المعارف العثمانیہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

یہ ایک زبردست علمی ادارہ ہے۔ اس کا ماضی اس پہلو سے شاندار رہا ہے کہ اس نے قدیم عربی مخطوطات کو اس زمانے میں زیور طباعت سے آراستہ کیا جب عرب ممالک میں بھی عربی کتابوں کی اشاعت کا معقول نظم نہیں تھا۔ اس نے بعض اہم کتابیں شائع کیں جن میں بیہقی کی سنن کبریٰ، بقاعی کی نظم الدرر، علی متقی ہندی کی کنز العمال حاکم کی مستدرک، طحاوی کی مشکل الآثار، ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، ابن حجر کی تہذیب التہذیب، زمخشری کی الفائق فی غریب الحدیث، ابن جوزی کی صفوۃ الصفوۃ جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ لیکن قریب کے زمانے میں اس ادارہ سے کوئی قابل ذکر کام انجام نہیں پایا ہے، اور اب اس میں جدید دور کی سہولتیں بھی مفقود ہیں۔ سکریٹری ادارہ نے اس کی خستہ حالی کو دیکھ کر بہت افسوس کیا اور اسے زندہ، متحرک اور فعال بنانے کی ضرورت کا اظہار کیا۔

دیگر سرگرمیاں

ادارہ کے تحت طلبہ میں تحریری و تصنیفی ذوق بڑھانے کے لیے "رائٹرس فورم" کے نام سے وقتاً فوقتاً پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں ادارہ کے زیر تربیت اسکالرس کے علاوہ مسلم یونیورسٹی کے باذوق طلبہ بھی شرکت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک پروگرام یکم مئی ۱۹۹۴ء کو منعقد ہوا جس میں جناب محمد مشتاق تجاروی قاسمی سابق اسکالر ادارہ تحقیق نے "اجتہاد عہد خلفائے راشدین میں" کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا۔ بعد میں سامعین کے بعض سوالات کے جوابات بھی دیئے۔

۲۳ ؍ ۲۴ ؍ اپریل ۱۹۹۴ء کو فاؤنڈیشن فار ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام "دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم کے مسائل اور آئندہ کے امکانات" کے موضوع پر دو روزہ سمینار منعقد ہوا۔ اس میں ادارہ کے رکن مولانا سلطان احمد اصلاحی نے شرکت کی۔ مقالہ پیش کیا اور مختلف مسائل پر مباحثہ میں بھی حصہ لیا۔

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کے ذمہ داران نے جامعہ میں شعبۂ ریسرچ و تحقیق شروع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کا مقصد وہاں کے اساتذہ کے علمی و تحقیقی مشاغل میں اضافہ کرنا ہے۔ اس منصوبہ کے خطوط کار اور عملی مراحل و تفصیلات طے کرنے کے لیے مسلم یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں مئی ۱۹۹۴ء کو ایک

میٹنگ ہوئی جس میں ذمہ داران جامعہ کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کے بعض اساتذہ نے بھی شرکت کی۔ اس میٹنگ میں رکن ادارہ مولانا سلطان احمد اصلاحی نے بھی شرکت کی اور اپنے مشوروں سے نوازا۔ (شعبۂ اطلاعات)

تحقیقات اسلامی سے متعلق چند گزارشات

- جن احباب کی سالانہ مدت خریداری ختم ہوگئی ہے وہ ازراہِ کرم اپنا زرتعاون ۵۵/- روپے سالانہ کے حساب سے جلد روانہ فرمائیں
- پاکستان کے لیے سالانہ زرتعاون ۱۰۰/- روپے ہے۔
- دیگر ممالک سے ۳۰/- ہندوستانی روپے یا اس کے مساوی رقم ہے۔
- لائف ممبری (اندرون ملک) کی زراعانت ۵۰۰/- روپے ہے۔
- بیرون ملک یہ رقم پانچ سو ڈالر یا اس کے مساوی ہے۔
- جو احباب اپنا زرتعاون ارسال فرمائیں وہ اپنا پتہ صاف صاف تحریر فرمائیں۔
- منی آرڈر کوپن پر بھی اپنا پتہ لکھا جائے۔
- بعض احباب کی رقوم یہاں موصول ہوچکی ہیں لیکن ان کا پتہ موجود نہ ہونے باعث انھیں رسالے نہیں روانہ کیے جاسکے۔ ان سے فوری توجہ کی درخواست ہے۔

عہدِ نبویؐ کے غزوات و سرایا

ڈاکٹر رؤفہ اقبال صاحبہ نے اس تصنیف میں اسلام کے نظریہ جہاد پر اسلامی موقف کی بے لاگ ترجمانی کی ہے اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب دیا ہے۔

آفسٹ کی طباعت۔ صفحات ۲۴۷ قیمت ۲۵ روپئے

ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲